Regd.L.No.7243

Phone : [illegible]

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1979

اس پرچے میں ہے

خصوصی خطاب بجشن نزول قرآن

اگست 1979

موضوع :

کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں

شائع کردہ : ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-۲ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک ۳½ پونڈ	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۲	ستمبر ۱۹۷۹ء	شمارہ ۹

فہرست

۱۔ لمعات ۲

۲۔ جشنِ نزولِ قرآن کی تقریب پر خطاب ..... (محترم پرویز صاحب) ۹

موضوع:۔ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں

۳۔ ادارۂ طلوعِ اسلام کی مطبوعات ۳۱

۴۔ "شرابِ کہن" (چھ خطبات) ..... (محترم پرویز صاحب) ۳۳

(۱) مستقل اقدار — (۲) قانونِ مکافاتِ عمل

(۳) دیر ہے اندھیر نہیں — (۴) افراد اور اُمت

(۵) افرادِ قوم کس طرح بنتے ہیں؟ — (۶) حکومت تمام اُمت کی ہوتی ہے

۵۔ صورِ اسرافیل ..... (شہدائے جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یاد میں) ۵۳

۶۔ جرمِ زنا کی سزا ..... (پروفیسر رفیع اللہ شہاب) ۵۶

۷۔ قانون دان حضرات توجہ فرمائیں! ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۷ ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

لمعات

اس باب میں دو آراء نہیں ہو سکتیں کہ انتشار اور اختلاف مملکتوں کو لے ڈوبتے ہیں۔ یہ اختلافات بالعموم سیاست کے پیدا کردہ ہوتے ہیں لیکن جب سیاسی مقاصد کو مذہب کا نقاب اوڑھا دیا جائے تو ان اختلافات کی نہ صرف شدت بڑھ جاتی ہے بلکہ یہ مٹ ہی نہیں سکتے۔ کھلی ہوئی سیاست میں، سیاسی پارٹیاں اپنے منشور بدلتی رہتی ہیں۔ لائحہ عمل میں تبدیلی کرتے رہتے ہیں۔ لوگ پارٹیاں بھی بدلتے رہتے ہیں، لیکن مذہب میں کسی قسم کی تبدیلی کفر اور ارتداد کا موجب قرار پا جاتی ہے۔ نماز میں زیر ناف ہاتھ باندھنے اور سینہ کے اوپر ہاتھ باندھنے کا تعلق مذہب سے ہے۔ یہ اختلاف قیامت تک رفع نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی سیاسی پارٹی کے منشور میں یہ شق داخل ہو جائے کہ اس کے ممبر وہی ہو سکتے ہیں جو سینے پر ہاتھ باندھیں تو یہ پارٹی کسی دوسری پارٹی سے اس باب میں مفاہمت ہی نہیں کر سکتی۔ اس لئے ان کے اختلافات مٹ ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا، کسی قوم میں مستقل انتشار موجود رکھنے کے لئے اور کسی مملکت کی جڑیں کھوکھلی کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کی سیاست کو مذہب کے ساتھ ملوث کر دیا جائے۔ (ہم "مذہب" کہہ رہے ہیں۔ دین نہیں۔ دین میں تو اختلافات اور تفرقہ رہ ہی نہیں سکتا)۔

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت بہت سی سیاسی پارٹیوں نے کی۔ ان کی مخالفت کی بنیاد سیاسی تھی۔ ان میں ایک پارٹی خاص طور پر ایسی تھی جس نے کہا کہ وہ اس مطالبہ کی مخالفت اس لئے کرتی ہے کہ اس کے نزدیک یہ مطالبہ غیر اسلامی ہے اس لئے اس کی مخالفت ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ اس مخالفت کی انتہا یہ تھی کہ جب ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کا اصولی فیصلہ ہو گیا اور مسلم اکثریت کے صوبے (گویا) ایک جداگانہ مملکت میں تبدیل ہو گئے تو اس جماعت نے اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو ورغلانا اور بھڑکانا شروع کیا کہ وہ اس تجویز کی مخالفت کریں۔ اس مقصد کے لئے ۱۸/۱۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو ٹانک میں جماعتِ اسلامی کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں اس جماعت کے ایک فرد نے مودودی صاحب سے متعین سوال کیا کہ جب مطالبہ مسلمانوں کے لئے ایک مملکت حاصل کرنے کا ہے تو پھر کونسا امر مانع ہے کہ ہم ان کا ساتھ نہ دیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب

جب آپ اس تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے

یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔

(روئداد جماعتِ اسلامی - حصہ پنجم - ص ۶۵)

ان سے کہا جاتا کہ مطالبہ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ آزاد مملکت قائم کرنے کے لئے ایک خطۂ زمین حاصل کرنے کا ہے۔ جب وہ خطۂ زمین مل جائے گا تو آپ وہاں اسلامی مملکت قائم کر لیجئے گا۔ اس خطۂ زمین کے حاصل کرنے کے راستے میں روڑے تو نہ اٹکائیے۔ اس کے جواب میں وہ کہتے:۔

> بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔

(سیاسی کشمکش - حصہ سوم - ص ۱۶۸)

یہ خطۂ زمین حاصل ہو گیا تو دنیا کیا دیکھتی ہے کہ مودودی صاحب اپنی جماعت سمیت یہاں موجود ہیں۔ پاکستان ان کی مسلسل مخالفت کے علی الرغم وجود میں آگیا تھا۔ یہ ان کے انا کی شکست تھی۔ اس لئے (کسی سازش کے آلۂ کار بننے کے لئے نہیں تو کم از کم) ان کے انا کی تسکین کے لئے ضروری تھا کہ یہ مملکت مستحکم نہ ہونے پائے۔ اس کا آسان طریقہ یہ تھا کہ اس میں مسلسل اختلافات اور انتشارات قائم رکھے جائیں۔ مذہب اس کے لئے نہایت کامیاب حربہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے مطالبہ پیش کر دیا کہ چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔ اس پر اس جذباتی قوم کی طرف سے نہایت بلند آہنگی سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا اور اس مطالبہ پیش کرنے والے کو اقامتِ دین کا سب سے بڑا داعی قرار دے دیا گیا۔ کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا[1] کہ جب آپ یہ کہتے تھے کہ اس مملکت کا اسلامی بننا ناممکنات میں سے ہے تو ایک ناممکن مطالبہ پیش کرنے سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ مسلسل پروپیگنڈہ کے زور پر یہ مطالبہ منوا لیا گیا تو اگلا مطالبہ یہ پیش کیا گیا کہ مملکت کا کوئی قانون قرآن اور سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اس پر پھر نعرۂ تحسین بلند ہوا اور کسی نے ان سے یہ پوچھا[1] کہ اس قدر مذہبی فرقوں کی موجودگی میں کیا یہ ممکن ہے کہ قرآن و سنت کی بنا پر ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کیا جا سکے جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں! مسلسل پروپیگنڈہ کی بنا پر اس شق کو دستورِ پاکستان میں داخل کرا لیا گیا۔ اس کے بعد جو حکومت قائم ہوئی اس جماعت نے اس کے خلاف یہ پروپیگنڈہ جاری رکھا کہ برسرِ اقتدار طبقہ فاسق و فاجر ہے جو ملک میں اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتا۔ آپ سوچئے کہ جس حکومت

---

[1] ان سے پوچھنے کی یہ ناکامیاں طلوعِ اسلام کے حصے میں لکھی تھیں جن کا یہ مسلسل خمیازہ بھگتتا چلا آرہا ہے۔

کے خلاف مذہب کی بنا پر اس قسم کی منافرت پھیلائی جائے وہ کبھی مستحکم ہو سکتی ہے؟ نتیجہ یہ کہ یہاں ہر حکومت کی بنیادیں متزلزل رہیں۔ مودودی صاحب نے بائیس سال تک مسلسل اس حربہ کو استعمال کیا۔ اس کے بعد جب دیکھا کہ اس کا اثر کچھ کمزور پڑتا جا رہا ہے تو ایک اور قدم اٹھایا۔ انہوں نے اگست ۱۹۷۰ء میں خود ہی یہ اعلان کر دیا کہ:-

قرآن و سنت کی بنا پر پبلک لاء کا کوئی ضابطہ ایسا نہیں مرتب کیا جا سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔ (ایشیا - ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

قوم میں سے پھر کسی نے ان سے اتنا نہ پوچھا کہ جب صورتِ حال یہ تھی تو آپ بائیس سال تک اس کا مطالبہ کیوں کرتے رہے اور جن اربابِ اقتدار نے اسے ناممکن سمجھ کر اس پر عمل نہ کیا ان کے خلاف پروپیگنڈہ کیوں کرتے رہے؟ کسی نے نہ اتنا پوچھا، اور نہ ہی یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ اس اعتراف کا مقصد کیا ہے اور اب کیا کرنے والے ہیں! ان سے پوچھا گیا کہ جب قرآن و سنت کی بنا پر پبلک لاء کا ایسا ضابطہ نہیں بن سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو، تو پھر کیا کیا جائے؟ کیا مملکت کو لاقانون رہنے دیا جائے یا اسے سیکولر قرار دے دیا جائے؟ فرمایا کہ نہیں! نہ مملکت کو لاقانون رکھا جائے نہ سیکولر قرار دیا جائے۔ اس میں فقہ حنفی کو بطور پبلک لاء نافذ کر دیا جائے۔ کسی نے ان سے اتنا نہ پوچھا کہ آپ نے قرآن و سنت کی بنیاد کو اس لئے مسترد کر دیا ہے کہ اس پر تمام فرقے متفق نہیں ہو سکیں گے۔ تو کیا فقہ حنفی کو تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں گے؟ یہ سوال پوچھنا تو درکنار، کسی نے اتنا بھی نہ بھانپا کہ اس سے یہ اس ملک میں کتنے شدید اختلافات اور انتشار کی بنیاد رکھ رہے ہیں حالانکہ اس کا عملی مظاہرہ اُسی زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ مودودی صاحب کے اس اعلان پر ملک کے غیر حنفی فرقوں کی طرف سے سخت احتجاج ہوا۔ اس سے مودودی صاحب کو اطمینان ہو گیا کہ یہ حربہ کارگر ہو جائے گا۔ اس اطمینان کے بعد وہ بظاہر خاموش بیٹھ گئے اور مناسب موقعہ کا انتظار کرنے لگے۔ اس موقع تک پہنچنے سے پہلے (جس کے انتظار میں مودودی صاحب خاموش بیٹھ گئے تھے) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ فقہ حنفی کے متعلق مودودی صاحب کا اپنا عقیدہ کیا ہے؟ اصولی طور پر وہ کہتے ہیں:-

میں نہ مسلک اہلحدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت اور شافعیت ہی کا پابند ہوں۔ (رسائل و مسائل - حصہ اوّل - صـ ۲۳۵ - ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

فقہ حنفی کے متعلق ان کا ارشاد ہے:-

امام ابو حنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں - یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحابؒ کچھ اور کہتے ہیں۔
(رسائل و مسائل - حصہ اوّل - صـ ۲۷۴-۷۵)

آئمہ مجتہدین کے متعلق کہتے ہیں:-

میرا طریقہ یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا اور جب میرا اُن کے

بیانات سے اطمینان نہیں ہوتا تو غور و فکر کر کے رائے قائم کرتا ہوں۔

(رسائل و مسائل - حصہ دوم - صفحہ ۱۶۰)

حنفیت کا سارا مدار اپنے آئمہ کی تقلید پر ہے۔ اس باب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں :-

میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ، بلکہ اس سے بھی شدید تر چیز ہے۔

(رسائل و مسائل، حصہ اول صفحہ ۲۴۴)

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ مودودی صاحب فقہ حنفی کا نفاذ اس لئے نہیں چاہتے تھے کہ اس سے ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہو جائیں گے۔ ان کا مقصد واضح ہے کہ اس سے ملک میں ایسے مذہبی اختلافات رونما ہوں گے جن کا مٹانا ناممکنات میں سے ہوگا۔ اس طرح اس مملکت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی اور وہ یہ بھی کہہ سکیں گے کہ دیکھا! میں جو کہتا تھا کہ یہ مملکت اسلامی نہیں بن سکے گی، وہ دعویٰ کس قدر صحیح ثابت ہوا؟

اب آیئے اس موقعہ کی طرف جس کے انتظار میں مودودی صاحب خاموش بیٹھے تھے۔ بھٹو حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن کے لئے جو متحدہ محاذ قائم ہوا تو اس میں بہت بڑی اکثریت ان جماعتوں کی تھی جو فقہ حنفی کی ماننے والی تھیں۔ جماعتِ اسلامی اس محاذ میں شامل ہو گئی اور نظامِ مصطفےٰ ؐ کے معاملہ میں سب سے بلند آہنگ ہو گئی۔ اس سے بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹ گیا۔ لیکن اس تحریک کا مقصد صرف بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹانا نہیں تھا۔ اس سے مقصدِ اولیٰ یہ تھا کہ آنے والی حکومت کو اچھی طرح محسوس کرا دیا جائے کہ جو حکومت نظامِ مصطفےٰ ؐ کے راستے میں حائل ہو، قوم اس کا تختہ الٹ دیا کرتی ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ نظامِ مصطفےٰ ؐ کی عملی شکل کیا ہے، تو انہوں نے کہہ دیا کہ پبلک لاز کی حیثیت سے فقہ حنفی کا نفاذ۔ چنانچہ اس کا آغاز اس فقہ کے مطابق چند حدود کے نفاذ سے کر دیا گیا۔ اس پر غلغلہ مچا دیا گیا کہ صدرِ اوّل کے بعد پھر سے اسلام کا احیا ہو گیا ہے۔ اس سے ملک کے غیر حنفی فرقوں کی طرف سے مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی صدرِ مملکت کو اس کا احساس ہو گیا کہ ان قوانین پر عمل درآمد ناممکن ہے۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں اس کا اعتراف کیا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہی وجہ ہے جو ان پر عمل درآمد بھی نہیں ہو رہا اور ان کی اگلی قسطوں کا اعلان اور نفاذ بھی نہیں کیا جا رہا۔ اس کا سبب کچھ بھی ہو، یہ واقعہ ہے کہ اتنے ہی سے قوم میں مذہب کی بنیاد پر اختلاف اور انتشار پیدا ہو چکا ہے یہی مودودی صاحب کا مقصد تھا۔

اب آیئے ان کے دوسرے مقصد کی طرف، یعنی حکومت کے خلاف حسبِ منشا پراپیگنڈہ۔ سو یہ داستان بڑی دلچسپ ہے۔

جماعتِ اسلامی ضلع لاہور کے امیر، سید اسعد گیلانی صاحب کا ایک مبسوط مقالہ، روزنامہ نوائے وقت کی ۲۴ رجولائی ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ۔۔۔ فکر و تشویش

کے بنیادی عوامل ـــ اس میں وہ لکھتے ہیں :-

اسلام ایک عالمگیر دین ہے ، مسلمانوں کو مختلف معاندانہ گروہ بندیوں میں بانٹنا ، اور ایک خدا ۔ ایک رسول ۔ ایک قرآن اور ایک کلمے پر ایمان رکھنے والوں کو باہم ٹکرانا ہمارے دشمنوں کا شیوہ اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کا آزمودہ نسخہ ہے۔ افسوس ہے کہ پاکستانی مسلمانوں کے ساتھ یہ عمل بڑے عرصے سے ہو رہا ہے اور پچھلے دو سال کے عرصہ میں تو تقسیم و تنفیر کا یہ عمل اتنی شدت اور وسعت سے ہوا ہے کہ اب قوم میں یہ سکت نظر نہیں آتی کہ وہ میدانِ زندگی میں کسی پُرجوش عمل کا مظاہرہ کر سکے گی ۔ آنے والے انتخابات کی طرح سے مایوسی کے اُبھرتے ہوئے سائے بھی اسی نومیدی کی غمازی کرتے ہیں۔

وقت ہوتا تو ہم تفصیل سے بتاتے کہ مسلمانوں میں باہمی نفرت پیدا کرنے کا جو عمل جماعتِ اسلامی نے گذشتہ چالیس سال سے جاری کر رکھا ہے اس کی مثال ہماری تاریخ میں نہیں ملتی ۔ ہم اس وقت اپنے آپ کو موجودہ اختلافات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں ۔ ہم محترم گیلانی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ جانتے ہوئے کہ حنفی قوانین کے نفاذ سے ملک میں فرقہ وارانہ اختلافات عملاً نمودار ہو جائیں گے اور مسلمانوں میں باہمی نفرت پھیل جائے گی ، ان قوانین کو قوانینِ خداوندی قرار دینے اور ان کے نفاذ پر خوشیوں کے شادیانے بجانے والے ان اختلافات کے ذمہ دار نہیں تو اور کون ہے ؟ فقہ حنفی کو پبلک لاز کی حیثیت سے ملک میں نافذ کرنے کی تجویز کس نے پیش کی تھی اور انہیں زور دیکر کس نے نافذ کرایا ہے ؟

اب آگے بڑھئے ۔ قوم میں یاس اور نا امیدی کا ذکر کرنے کے بعد گیلانی صاحب لکھتے ہیں :-

اس عرصہ میں جن دو گرامی قدر اصحاب پر قوم کو مایوسی اور قنوطیت کے غار میں دھکیلنے کی خاص طور پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ مولانا شاہ احمد نورانی ، اور صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب ہیں۔

مولانا نورانی صاحب کا قصہ تو چھوڑیئے کہ یہ ان حضرات کی جنگِ زرگری ہے ۔ جب نورانی صاحب ، متحدہ محاذ میں جماعتِ اسلامی کے ساتھ تھے تو وہ قطبِ دوراں اور ابدال العصر تھے ۔ اب جو وہ ان سے الگ ہو گئے ہیں تو ملک کی تمام خرابیوں کا موجب ان کی ذات ہے ۔ کل کو ان میں باہمی مصالحت ہو جائے گی تو وہ پھر غوث اور قطب قرار پا جائیں گے ۔ گیلانی صاحب جنرل ضیاء الحق کے متعلق لکھتے ہیں :-

مولانا نورانی کی طرح جنرل محمد ضیاء الحق نے بھی مایوسی میں اضافہ کیا ہے ۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جس قوم نے ان کی آمد پر کھلے بندوں خوشی اور مسرت کا اظہار کیا تھا وہ ان کے طرزِ عمل کے سبب مایوسی اور بددلی کا شکار ہوتی چلی جا

رہی ہے۔

جنرل ضیاء الحق کا وہ کونسا طرزِ عمل ہے جس کے سبب قوم مایوسی اور بددلی کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہے؟ یہ طرزِ عمل کہ شرعی قوانین کی رو سے:۔

کسی ایک مجرم پر بھی اب تک حد جاری نہیں ہوئی۔ چنانچہ جرائم روز بروز بڑھ رہے ہیں اور مخالفینِ اسلام کو طعن و طنز کے تیر برسانے کا ایک اور موقع مل گیا ہے۔

یہی حالت زکوٰۃ اور عشر کے احکام کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب جنرل ضیاء الحق نے کہا تھا کہ ان قوانین کی رو سے شاید ہی کسی مجرم کو سزا مل سکے۔ کیونکہ ان کی رُو سے جرم کا ثابت کیا جانا بہت مشکل ہے، تو کیا جماعتِ اسلامی نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی اور کہا تھا کہ جنرل صاحب غلط کہتے ہیں؟ اس وقت تو آپ خاموش رہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان سے متفق تھے اور اب اسی بات کو ان کے خلاف اچھالا جا رہا ہے۔

قارئین نے غور فرمایا کہ یہاں مذہب کے نام سے کس قسم کا کھیل کھیلا جا رہا ہے؛ پہلے بائیس سال تک یہ مطالبہ پیش کیا جاتا رہا کہ پبلک لاز کا ضابطہ قرآن اور سنت کے مطابق مرتب کیا جائے۔ اور ایسے ناممکن العمل مطالبہ کی آڑ لے کر ہر حکومت کے خلاف نفرت پھیلائی جاتی رہی۔ اس کے بعد کہا کہ کتاب و سنت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ نہیں بن سکتا۔ اور اس کے بجائے فقہ حنفی کے ایسے قوانین نافذ کرا دیئے جن پر عمل درآمد ناممکنات میں سے ہے۔ اور اب ان کی آڑ لے کر پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ حکومت ان پر عمل کیوں نہیں کراتی۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس موقعہ پر اس پروپیگنڈہ سے مقصد کیا ہے؟ اسے گیلانی صاحب نے اپنے مقالہ کے آخری حصہ میں ان الفاظ میں واشگاف کر دیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس دلدل سے نکلنے کی صورت کیا ہے؟ ظاہر ہے جو صورت بھی ہوگی وہ ٹھوس اور مثبت عمل کا لبادہ اوڑھے بغیر اپنا نتیجہ نہ دکھائے گی اور بدقسمتی سے یہی ایک شئے ہمارے ہاں عنقا ہو کر رہ گئی ہے لیکن کہنا تو انہی سے ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار ہوتی ہے کہ خدارا منزل کی طرف رخ کر کے چلیئے میرے نزدیک اس دلدل سے نکلنے کے لئے تین امور پر بلا تاخیر عمل ہونا چاہیئے۔

(۱) نظریاتی کونسل کے مشورے سے قرآن و سنت کی روشنی میں اساسی ضابطہ اخلاق بنا کر نافذ کر دیا جائے اور جو فرد یا گروہ اس کی خلاف ورزی کرے، اس کا معاملہ اس کونسل کے تین ارکان کے بنچ کے سامنے پیش کیا جائے جو اس فرد یا جماعت کو پانچ سال کے لئے قومی سیاسیات سے نکال دے۔

(۲) اسمبلیوں میں خاص طور پر قومی اسمبلی کے ممبران کا معیارِ اخلاق و قابلیت مقرر

کر دیا جائے اور اس سے فروتر افراد کو مسلمانوں کی قسمتوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے امیدوار نہ بننے دیا جائے۔ یہ معیار بھی اسلامی نظریاتی کونسل مقرر کر سکتی ہے۔ اور اسے انتخابی قوانین کا حصہ بنایا جا سکتا ہے۔

(۳) موجودہ نظامِ انتخاب کے بجائے متناسب نمائندگی کا طریق کار اختیار کیا جائے۔ یعنی انفرادی امیدواروں کے بجائے جماعتوں کو ووٹ دینے کا اہتمام کیا جائے۔ سیاسی جماعتوں کی فراوانی کا علاج بھی یہی ہے۔ اس طرح آئندہ انتخابات سے ہمارے بیشتر مسائل حل ہو جائیں گے اور قوم بھی انتخابی بحران اور فتنہ و فساد سے بچ جائے گی۔

اس پروپیگنڈہ سے مقصد یہ ہے کہ حکومت پر دباؤ ڈالا جائے کہ انتخابات ایسے انداز سے کرائیں جائیں کہ جن افراد یا جماعتوں کے ہاتھوں جماعتِ اسلامی کو شکست کا خدشہ ہو انہیں انتخابات میں حصے لینے کا نااہل قرار دے دیا جائے۔ اس سے اقامتِ دین کا مقصدِ عظیم حاصل ہو جائے گا اور اسلام کا بول بالا ہو جائے گا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو جماعتِ اسلامی پراپیگنڈہ جاری رکھے گی کہ اربابِ اقتدار چاہتے ہی نہیں کہ یہاں اسلام رائج ہو۔

کس قدر دُور رس ہوتی ہیں اس سیاست کی چالیں جو مذہب کا نقاب اوڑھ کر میدان میں آتی ہیں ـــــ دُور رس تو وہ ضرور ہوتی ہیں لیکن خدا کا یہ فیصلہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے کہ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ (۳۵/۴۳) تخریبی چالیں چلنے والوں کی چالیں پلٹ کر انہی کو گھیر لیا کرتی ہیں۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔

محترم پرویز صاحب کا

درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ)

ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)

M9 SUTTON COURT RD
LONDON E13 — 9NR.
PHONE 01—552—1517

لاہور میں ہر جمعہ ۸½ بجے صبح (فون ۸۸۰۸۰۰) ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن)

کراچی میں ہر جمعہ کو ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ ۲۴۔ ہارون چیمبرز نہ الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ کراچی ۲۔

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان۔ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر۔ بالمقابل دی آئی پی مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ باڑہ روڈ

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خاں۔ نواب علی روڈ

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

باسمہ تعالیٰ

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

قرآن کی رُو سے

کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں

جشن نزولِ قرآن کی تقریب منعقدہ ۹ اگست ۱۹۷۹ء پر
پرویز صاحب کا خطاب

کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں

عزیزانِ گرامی قدر

السلام علیکم

جیسا کہ آپ نے اعلانات میں دیکھ لیا ہوگا، آج کے درس کا اجتماع جشن نزولِ قرآن کی تقریب منانے کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔ یہ تو دعوے سے نہیں کہا جا سکتا کہ عید الفطر کی تقریب کے لئے جشن نزولِ قرآن کی اصطلاح پہلی بار ہم نے اختیار کی ہے لیکن اتنا حتمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس حسین و جمیل اصطلاح کی عام نشر و اشاعت کی سعادت طلوع اسلام ہی کے حصے میں آئی ہے اور اس پر ہم جس قدر بھی فخر کریں بجا ہے۔ اس جشن کا منانا خود ارشادِ خداوندی کی تعمیل ہے۔ چنانچہ اس نے نزولِ قرآن کریم کے سلسلے میں فرمایا ہے: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۱۰/۵۸) "اے رسول! تم ان سے کہدو کہ یہ محض خدا کے فضل و کرم سے ہے کہ اس نے تمہیں قرآن جیسی نعمت عطا کر دی ہے۔ اگر تم تمام دنیا کی دولت بھی جمع کر لو تو یہ اس سے بھی زیادہ گراں بہا ہے"۔ قرآن مجید کی وہ کیا خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اسے اس قدر گراں بہا قرار دیا گیا ہے، ان کی تفصیل سے تو سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ لیکن اس آیت کے سلسلے میں اس کی جس خصوصیتِ کبریٰ کا ذکر کیا گیا ہے وہ میری بصیرت کے مطابق، مرکزی اور بنیادی ہے۔ اور وہی میرے آج کے درس کا نقطۂ ماسکہ بھی ہے۔ فرمایا:-

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۔ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۵۷)

اے نوعِ انسان! تمہارے نشو و نما دینے والے نے ایک نسخۂ کیمیا بھیجا ہے جس سے تمہارے دل کے روگ شفا یاب ہو جائیں گے۔ اس نسخے کے ساتھ ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ جو لوگ اس کی حذاقت پر یقین رکھیں گے انہیں یہ شفا بھی عطا کرے گا اور سامانِ نشو و نما بھی۔

یہاں قرآنِ کریم نے "شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ" کہا ہے جسے میں نے "دل کے روگ" کہکر پکارا ہے۔ یہ قرآنِ کریم کے

دلوں کے روگ

ان الفاظ کا ترجمہ ہے جو دوسرے مقام پر یوں آئے ہیں ـــــ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ـــــ ان الفاظ کا ٹھیٹھ ترجمہ "دلوں کے روگ" ہے۔ ان امراض کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بہ دیکھے بھالے، سمجھے سوچنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے ـــــ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ۔ وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ

غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۲/۷) ـــــ اور وہ اس آتشِ خاموش و پنہاں میں جلتے بھنتے رہتے ہیں۔

زمانۂ نزولِ قرآن میں دنیا میں انسان کی جسمانی بیماریوں کے لئے تو بہت سے الفاظ رائج تھے لیکن دل کی بیماریوں کے لئے کوئی خاص اصطلاح وضع نہیں ہوئی تھی۔ اور اصل یہ ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک بھی ان بیماریوں کا کوئی خاص تصور متعین نہیں ہوا تھا ـــــ حسد، کینہ، منافقت، مکاری، فریب کاری، خود غرضی۔ مفاد پرستی۔ دنایت وغیرہ کو اخلاقی برائیاں سمجھا جاتا تھا۔ انہیں امراض سے تعبیر نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن قرآن کریم نے انہیں "امراضِ قلب" کہہ کر پکارا ہے۔ چودہ سو سال بعد جب نفسیاتی تحقیقات کا دائرہ وسیع اور قدرے عمیق ہوا تو یہ حقیقت تسلیم کی گئی کہ یہ برائیاں اور خباثتیں درحقیقت نفسیاتی امراض (PSYCHOLOGICAL COMLEXES) ہیں۔ یہی وہ امراض ہیں جن کے علاج کے لئے قرآنی نسخہ کو "شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر صرف اس ایک حقیقت پر ہی غور کیا جائے تو وحی خداوندی کی اہمیت اور قرآنِ مجید کی عظمت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

اب آگے بڑھیئے اور قرآنِ کریم میں پیش کردہ دوسری بنیادی حقیقت کو سامنے لائیے۔ علماءِ علم النفس سالہا سال کی تجسس و تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان نفسیاتی امراض کی علامات اور ان کے نمودار ہونے کی شکلیں اور صورتیں کچھ ہی کیوں نہ ہوں ان کا بنیادی سبب صرف ایک ہے۔ یعنی خوف!

نفسیاتی امراض کا بنیادی سبب

خوف، خواہ اس کا سبب کچھ بھی کیوں نہ ہو، انسان کے دل کی گہرائیوں میں (یعنی اس کے لاشعور میں) پیوست ہو کر اس کی ذات میں بگاڑ پیدا کر دیتا ہے جو مختلف نفسیاتی امراض کی شکل میں نمودار ہوتا رہتا ہے۔ ان کے نزدیک اگر انسان کے لاشعور سے خوف کے احساس کو دور کر دیا جائے تو ان امراض کو شفا حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ میں آگے چل کر تفصیل سے عرض کروں گا، قرآن یہی کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بڑے بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اسلام سے پہلے، تین مذاہب عالمگیر حیثیت رکھتے تھے (۱) بدھ مت (۲) عیسائیت، جس میں اصل کے اعتبار سے یہودیت بھی شامل تھی، اور (۳) ایران کی مجوسیت۔ بدھ مت، میں اصول تعلیم یہ تھی کہ دنیا کرب اور اذیت (PAIN) کا گہوارہ ہے۔ عیسائیت کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اور گناہ (SIN) لازم و ملزوم ہیں۔ اور مجوسیت کا فلسفہ یہ تھا کہ دنیا میں خیر اور شر کی جنگ جاری ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے :-

> اسلام نظامِ فطرت میں کرب و اذیت، گناہ اور کشمکش کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ انسان کے اخلاقی ارتقاء کے راستے میں یہ موانعات حائل نہیں۔ یہ درحقیقت خوف ہے جس کا یہ شکار ہوتا ہے۔ انسان اپنے سلسلۂ ارتقاء کی بلند ترین سطح پر اس وقت پہنچتا ہے جب وہ خوف اور حزن سے یکسر آزاد ہو جائے ..... اسلام کا اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف و حزن سے آزاد کر کے اسے اس کی ذات کی ممکنات اور مضمر قوتوں کا احساس دلا دے اور اس کے شعور میں اس حقیقت کو بیدار کر دے کہ اس کی ذات لامتناہی قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ (آگے چل کر اقبالؒ کہتا ہے) اسے پھر سمجھ لیجئے کہ دنیا میں ہر برائی (VICE) کی جڑ خوف ہے۔

(TROUGHTS AND REFLECTIONS OF IQBAL. PP. 34 - 37)

اقبال کا سارا پیغام قرآن مجید کی روشنی میں انسان کو اس کے حقیقی مقام سے آگاہ کر کے اس کے دل سے خوف

خوف کے خلاف جہاد

کے احساس کو مٹا دینا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اقبالؒ کا پیغام خوف کے خلاف مسلسل جہاد ہے۔ مثلاً وہ اپنی مثنوی "رموزِ بے خودی" میں لکھتے ہیں :-

ہر شرِ پنہاں ... در قلب ... ست　　اصلِ او بیم است اگر بینی درست
لابہ و م... ... ...غ　　ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ
پردۂ زو... ریا ...　　فتنہ را آغوشِ مادر دامنش
...انکہ از ہمت ... نباشد ...　　می شود خوشنود با ناسازگار
... مصطفیٰؐ فہمیدہ است
... خوف مضمر دیدہ است　　(رموزِ بے خودی صفحہ ۱۱۱-۱۱۰)

...ف کے اندر کس ... مضمر ہوتا ہے ... ... ذرا آگے چل کر کی جائے گی۔ سرِ دست یہ دیکھئے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے خوف کی وجہ سے انسان کی حالت کیا ہو چکی تھی۔ اقبالؒ ہی کے الفاظ ہیں :-

بود انساں در جہاں انساں پرست　　ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش　　بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر　　بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت　　باج بر کشتِ خرابِ او نوشت
در کلیسا اُسقفِ رضواں فروش　　بہرِ ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
از غلامی فطرتِ او دوں شدہ　　نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ　　(رموزِ بے خودی صفحہ ۱۱۹)

... اسلام کے وقت نوعِ انسان کی یہی حالت تھی۔ وہ مستبد حکمرانوں کی ذلت آمیز اور اذیت ناک زنجیروں میں جکڑا ہوا اور ...ی پیشوائیت کے غضب ناک اور قہر آلود بندھنوں میں بندھا ہوا تھا کہ رسالتِ محمدیہ نے : يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَ...لَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) فرعونوں کی ان زنجیروں کو توڑ دیا اور ہامانوں کی ان بندھنوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ ...الؒ ہی کے الفاظ ہیں :

تا امینے حق بحقداراں سپرد　　بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد　　کوہکن را پایۂ پرویز داد
قوتِ او ہر کہن پیکر شکست　　نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید　　بندہ را باز از خداونداں خرید

(رموزِ بے خودی صفحہ ۱۲۰-۱۱۹)

قرآن کریم نے اس انقلاب آفریں پیغام اور انسانیت ساز و حریت بخش تعلیم کا ماحصل چار ایسے الفاظ میں بیان کر دیا ہے جن کی جامع... ... انسانی بصیرت وجد کرنے لگ جاتی ہے۔ فرمایا : فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸)۔ "جو لوگ ہمارے بتلائے ہوئے راستے پر چلیں گے انہیں نہ کسی قسم کا خوف دامنگیر ہوگا نہ حزن"۔ قرآنِ کریم نے یہاں دو الفاظ استعمال کئے ہیں ——— خوف اور حزن ——— معنویت کے اعتبار سے ان

خوف و حزن

دونوں میں ایک لطیف فرق ہے جسے دیدۂ بینا ہی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ عام فہم الفاظ میں خوف کے متعلق یوں سمجھئے کہ یہ اُس خطرہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے جو محسوس طور پر سامنے آجائے۔ ہم سانپ سے ڈرتے ہیں، شیر سے خوف کھاتے ہیں، لیکن حزن دل کی اس درد انگیز افسردگی اور اندوہناک آزردگی کا نام ہے جسے ہم نہ کسی کو دکھا سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے۔ اور اکثر اوقات تو اس کا کوئی محسوس سبب خود ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتا۔

قرآن مجید کے انگریزی تراجم میں خوف کا ترجمہ (FEAR) اور حزن کا (GRIEF) کیا جاتا ہے۔ ذہنی طور پر تو ان الفاظ سے کام چل جاتا ہے لیکن حزن سے جو چوٹ دل پر پڑتی ہے وہ ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ ہمارے ہاں کی شاعری (بالخصوص تغزل) کا چونکہ محبوب ترین موضوع حزن و ملال ہے اس لئے اس میں اس قلبی اضطراب کا اظہار مختلف انداز سے کیا جاتا ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کا ایک بڑا بلیغ و عمیق شعر ہے جس میں انہوں نے خوف اور حزن کے فرق کو بڑے لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

صدائے تیشہ کہ بر سنگ می خورد دگر است
خبر بگیر کہ آواز تیشہ و جگر است

جب تیشہ چٹان پر پڑتا ہے تو اس کی آواز میں اور جب وہ جگر پر پڑتا ہے اس کی صدا میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہمارا ایک اُردو غزل گو شاعر اس فرق کو ذرا شوخ انداز میں بیان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

کسے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے
انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے

خوف کا مشاہدہ "رنگ و بو" سے ہوتا ہے اور حزن کا احساس "خونِ آرزو" سے۔ خونِ آرزو کا کسی دوسرے کو دکھانا تو ایک طرف، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، بعض اوقات تو انسان کو خود بھی پتہ نہیں چلتا کہ میری افسردگی اور آزردگی جو میری بہار کو خزاں بنا دیتی ہے کا سبب کیا ہے جگرؔ اس قسم کے انجانے غم کے متعلق کہتا ہے کہ

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

یہ کیوں ڈوبا جا رہا ہے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ ہے حزن۔ عملی دنیا میں خوف اور حزن کے فرق کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک مستبد حکمران اپنے مخالف سے کہتا ہے کہ اگر تم اپنی روش سے باز نہ آئے تو اس تلوار کو دیکھ لو۔ اس سے اس کے دل میں خوف پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے فلاں درگاہ پر ایک منت مانی تھی جسے میں نے پورا نہیں کیا۔ اب مجھے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خدا معلوم مجھ پر کونسا غضب نازل ہوگا۔ یہ حزن ہے۔ وسیع معنوں میں یہ سمجھو کہ انسانی حکمرانی کی طرف سے محکوم انسانوں کو جو خطرات لاحق ہوتے ہیں، اسے خوف سے تعبیر کیا جائے گا اور اربابِ شریعت اور اصحابِ طریقت جس قہرِ خداوندی سے ڈراتے رہتے ہیں، وہ حزن کہلائے گا۔ قرآن کریم نوعِ انسان کو ان ہر دو سے نجات دلانے کی ضمانت دیتا ہے۔ جب انسانوں کو اس ڈر (خوف اور حزن) سے نجات مل جائے گی تو ان سے پیدا شدہ امراض (نفسیاتی پیچیدگیوں) سے شفا حاصل ہو جائے گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ قرآن اس خوف اور حزن کو دور کس طرح کرتا ہے؟ ہم نے دیکھا ہے کہ جب بعض انسان دوسرے انسانوں پر حکومت کرتے ہیں تو محکوموں کے دل میں خوف اور حزن پیدا ہوتا ہے۔ سیاسی حکمران انسانوں کے جسموں پر حکومت کرتے ہیں۔ اور مذہبی پیشوا ان کے قلب و دماغ پر۔ قرآن کریم نے دو لفظوں میں اس کا علاج بتا دیا ہے ــــ محاورہ کے طور پر نہیں۔ سچ مچ دو لفظوں میں۔ اور وہ دو لفظ ہیں ــــ لا الٰہ ــــ الٰہ کے معنی ہیں صاحبِ اقتدار۔ وہ جسے حقِ حکومت حاصل ہو۔ لہٰذا، لا الٰہ

لا الٰہ کے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات میں کوئی صاحبِ قوت ایسا نہیں جسے دوسرے انسانوں پر حقِ حکومت حاصل ہو۔ جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے، وہ جن قوانین کے تابع سرگرمِ عمل ہے کوئی قوت ایسی نہیں جو ان قوانین کی جگہ اپنے قوانین نافذ کر سکے، یا ان میں کوئی تبدیلی کر سکے۔ لہٰذا، خارجی کائنات میں لا الٰہ کا عمل از خود کارفرما ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ — انتہائے کارِ عالم لا الٰہ
چرخ را از زورِ او گردندگی — مہر را پایندگی، رخشندگی
بحر گوہر آفرید از تابِ او — موج در دریا تپید از تابِ او (رموزِ بیخودی صفحہ ۱۶)

یہ مسلک خارجی کائنات کا ہے۔ انسانی دنیا میں انسانوں پر انسان حکومت کرتے ہیں۔ اگر انسان اس حقیقت پر ایمان لے آئے کہ لا الٰہ — کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں، تو وہ خوف و حزن سے مامون ہو جائے گا۔ لہٰذا، خوف و حزن سے نجات پانے کے پروگرام کی منزلِ اوّل یہ ہے کہ لا الٰہ کو اپنے دل کا یقین اور زندگی کا معمول بنایا جائے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست — ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست
پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات — تازہ از ہنگامۂ او کائنات
بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز؟ — تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز
ہر کرا ایں سوز باشد در جگر — ہولش از ہولِ قیامت بیشتر
لا مقامِ ضربہائے پے بہ پے — ایں غوِ رعد است، نے آوازِ نے (پس چہ باید کرد صفحہ ۱۹)

آگے چل کر وہ اربابِ شریعت اور اصحابِ طریقت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

ایکہ اندر حجرہ ہا سازی سخن — نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن
اینکہ می بینی، نیرزد با دو جو — از جلالِ لا الٰہ آگاہ شو
ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لاست — جملہ موجودات را فرمانرواست (صفحہ ۲۳)

مردِ حُر لا الٰہ کو مسلکِ زندگی قرار دے لینے والے کو قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے، اور اقبالؒ اسے مردِ حُر کہتا ہے۔ یعنی وہ جو خوف و حزن سے آزاد ہو۔ مردِ حُر کے متعلق وہ کہتے ہیں ؎

مردِ حُر از لا الٰہ روشن ضمیر — می نہ گردد بندۂ سلطان و میر
ما کلیسا دوست، ما مسجد فروش — او ز دستِ مصطفیٰؐ پیمانہ نوش
دارد اندر سینہ تکبیرِ امم — در جبینِ اوست تقدیرِ امم
در جہانِ بے ثبات او را ثبات — مرگ او را از مقاماتِ حیات (ایضاً صفحہ ۳۲)

جاوید نامہ کے آخر میں انہوں نے (جاوید کی وساطت سے) ہماری نژادِ نو کو ایک پیغام دیا ہے۔ پیغام کیا ہے؟ صورِ اسرافیل ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

اے پسر ذوقِ نگہ از من بگیر — سوختن در لا الٰہ از من بگیر

لا الٰہ گوئی؟ بگو از روئے جاں — تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں
ایں دو حرفِ لا الٰہ گفتار نیست — لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہاری است — لا الٰہ ضرب است و ضربِ کاری است (جاوید نامہ صـ۲۴۳)

اقبالؒ نے کہا ہے کہ

ایں دو حرفِ لا الٰہ گفتار نیست — لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست

صدرِ اوّل کے مسلمان (یعنی مردانِ حُر) اس حقیقت کو کس طرح سمجھ چکے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے جو کتبِ روایات میں گوہرِ تابدار کی طرح تابندہ ہے۔ جب نبی اکرمؐ کی مکّی زندگی میں قرآنی انقلاب کے امکانات بعید سے نظر آنے لگے تو انصارِؓ مدینہ کا ایک وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ پیشکش کی کہ آپؐ مدینہ تشریف لے چلیئے کہ وہاں کی فضا اس انقلاب کے لئے زیادہ سازگار ہے۔ آپؐ نے اس تجویز پر اظہارِ رضامندی فرمایا اور ان سے کہا کہ آپ اس امر کا عہد کریں کہ اس راستے میں کتنی مشکلات بھی کیوں نہ پیش آئیں آپ اس دعوت کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس عہد کی پختگی کی علامت کے طور پر آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنا شروع کیا (بیعت کا مفہوم یہ تھا کہ ہم اس مقصد کے حصول کے لئے اپنا سب کچھ آپؐ کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں) اس وفد کا سربراہ دروازے میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ آپ لوگ یہ عہد تو کر رہے ہیں لیکن آپ نے اس کے نتائج اور عواقب پر بھی غور کر لیا ہے؟ یہ لا الٰہ کا اقرار عرب اور عجم کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر یہ عہد کرو۔

عرب و عجم کے خلاف اعلانِ جنگ

آپ نے دیکھا کہ وہ حضرات لا الٰہ کا مفہوم کس وانشگاف انداز میں سمجھ چکے تھے۔ لا الٰہ کے یہی مضمرات ہیں جن کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

نبودِ تو برافتد رزم نگہ را — کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
چہ می گویم مسلمانم، بلرزم — کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را (ارمغانِ حجاز صـ۳۵)

اُس دور میں اس عہد کا نام ایمان تھا جسے قرآن کریم میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ (۹/۱۱۱)۔ اس ایمان کی رو سے مومن اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا تھا اور خدا اس کے عوض اسے جنت عطا کر دیتا تھا —— وہ جنت جس کے متعلق واضح طور پر کہہ دیا جاتا تھا کہ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡکُمۡ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ (۷/۴۹)۔ "اس میں تمہیں نہ خوف ہوگا نہ حزن"۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ ایمان کے اس جزوِ اوّل کا عملی مفہوم کیا تھا۔ یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

نہ ہر کس خودگر و ہم خودگداز است — نہ ہر کس مستِ ناز اندر نیاز است
قبائے لا الٰہ خونیں قبائے است — کہ بر بالائے نامرداں دراز است (ارمغانِ حجاز صـ۲۰۷)

یہاں تک یہ بتایا گیا ہے کہ لا الٰہ کا مفہوم یہ تھا کہ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جسے حقِ حکومت حاصل ہو۔ لیکن انسانوں کی تمدنی زندگی کے لئے حکومت کا وجود ناگزیر ہے۔ حکومت کے معنے ہیں ایسی پابندیاں عائد کرنا جن سے افرادِ معاشرہ کے

باہمی روابط عدل و انصاف کی بنیادوں پہ استوار اور محکم ہوں۔ اگر معاشرہ میں ایسی پابندیاں عائد نہ کی جائیں تو اس میں انارکی پھیل جائے گی ——— فساد برپا ہو جائے گا۔ اس کے لئے قرآن کریم نے اس ایمان کا دوسرا جزء الا اللہ اس کے ساتھ پیوست کر کے توحید کے پروگرام کی تکمیل کر دی۔ لا الٰہ الا اللہ۔ یعنی دنیا میں خدا کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ اس کا پہلا حصہ اگر ہر قوت کی نفی کرتا ہے تو دوسرا حصہ خدا کے حقِ حکومت کا اثبات ہے۔

الا اللہ

در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے الّا می خرامد کائنات
لا و الا ساز و برگِ اُمتاں — نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں (پس چہ باید کرد ص۲۲)

قرآن کریم نے اس پورے فارمولے کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا جب کہا: لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ "کون سا نظامِ زندگی اختیار کیا جائے، اس باب میں کسی پر کوئی جبر نہیں۔ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔ صحیح راستہ اور غلط راہ نکھر کر سامنے آ چکی ہیں۔ صحیح راہ، خدا کی حکمرانی ہے اور غلط راہ انسانوں کی حکمرانی۔ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)۔ جس نے انسانوں کی حکمرانی سے انکار کر کے خدا کی حکمرانی کو تسلیم کر لیا تو اس نے ایسے سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔"

خدا کی عبادت

حکمرانی کے لئے عربی زبان اور قرآن کریم میں "عبادت" کی اصطلاح آئی ہے۔ "خدا کی عبادت" کے معنے ہیں خدا کی محکومیت اختیار کرنا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم کے افتتاحیہ (یعنی سورہ فاتحہ) میں دو لفظوں میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے۔ اسے ایک عبدِ مومن نماز کی ہر رکعت میں دہراتا ہے جب وہ (یوں کہیے کہ) باوضو، خانۂ خدا میں کھڑے ہو کر اور قبلہ کی طرف منہ کر کے، اپنے خدا سے کہتا ہے کہ

اِیَّاكَ نَعْبُدُ

ہم تیری اور صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ یہ لا الٰہ الا اللہ کی عملی تفسیر ہے۔ یہ اعلان کس طرح عرب اور عجم کے خلاف اعلانِ جنگ ہے، اسے اقبالؒ نے ایک شعر میں یوں سمٹا دیا ہے کہ

تا دو تیغِ لا و الا داشتیم — ماسوا اللہ را نشاں نگذاشتیم (مسافر ص۳۳)

جب ہمارے ہاتھ میں لا اور الا کی تلواریں تھیں تو ہم نے اللہ کے سوا ہر حکمران کا نام و نشان تک مٹا دیا تھا۔ خدا کا ہر رسول یہی انقلابی پروگرام لے کر آتا تھا۔ جب حضرت موسیٰؑ کو طور کی چوٹی پہ پہلی بار پکارا گیا تو ان سے کہا گیا: اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ "ہم اللہ ہیں"۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا "ہمارے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ فَاعْبُدْنِیْ (۲۰/۱۴)۔ لہٰذا تم ہماری اور صرف ہماری محکومیت اختیار کرو اور یہی پیغام لے کر فرعون کی طرف جاؤ جو اپنی حکمرانی کا سب سے بڑا دعویدار ہے (۲۰/۲۴)، لہٰذا، خدا کا سرکش ہے۔ یہی وہ پیغام تھا کہ جسے ایک اور فرعون کے عہدِ حکومت میں حضرت یوسفؑ نے اپنے قید خانے کے ساتھیوں کو ان الفاظ میں دیا تھا: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یاد رکھو! حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ کسی اور کو نہیں۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ "یہی محکم نظام ہے"۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۲/۴۰) "لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے جھک کر اپنے لئے ذلت و خواری کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ یہی انقلاب آفریں پیغام لے کر حضور نبی اکرمؐ تشریف لائے اور ساری دنیا سے پکار کر کہہ دیا کہ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ

وَلَا أُشْرِكَ بِهٖ (پ۱۳) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف خدا کی محکومیت اختیار کروں اور اس کے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہ کروں۔ یاد رکھیے! خدا کی حکمرانی سے یکسر انکار کر کے سیکولر نظام اختیار کر لینا کفر ہے۔ اور خدا کے نام سے انسانوں کے وضع کردہ قوانین نافذ کرنا شرک ہے۔

قریشِ مکہ نے حضورؐ کی دعوت کی جس قدر مخالفت کی اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ یہ بات مذہبی پیشوائیت کی طرف سے کبھی وضاحت سے سامنے نہیں لائی جاتی۔ کہا جاتا ہے تو صرف اتنا کہ حضورؐ ان کے بتوں کو بُرا کہتے تھے اور یہ چیز انہیں سخت ناگوار گزرتی تھی۔ اوّل تو یہی بات صحیح نہیں کیونکہ دوسروں کے معبودوں کو برا کہنے سے اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر وجہ نزاع یہ تھی تو ہجرت کے بعد قریش نے اس قدر لڑائیاں کیوں لڑیں؟ حقیقی وجہ نزاع وہ تھی جسے قرآن کریم نے اعلانِ جنگ قرار دیا ہے اور اسے ایسے زلزلہ انگیز انداز میں دہرایا ہے جس سے دلوں کی بستی تک میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ فرمایا: قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ۔ یہ لوگ جو خدا کی حکمرانی سے انکار کرتے ہیں اے رسول! انہیں یہ الٹی میٹم دے دو کہ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ۔ جن قوتوں کی محکومیت تم اختیار کئے ہوئے ہو میں کبھی ان کی محکومیت اختیار نہیں کروں گا۔ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ

قریشِ مکہ کے خلاف اعلانِ جنگ

اور تمہاری موجودہ روش سے ظاہر ہے کہ جس خدا کی حکومت کی میں دعوت دیتا ہوں تم اسے آسانی سے اختیار نہیں کرو گے اور مجھے مجبور کرو گے کہ میں اپنی اس دعوت کو چھوڑ کر تمہارا مسلک اختیار کر لوں۔ لیکن تمہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۔ جس طرح تم میری دعوت کو قبول نہیں کرو گے میں بھی تمہارا مسلک اختیار نہیں کروں گا۔ یہ میری طرف سے کھلا کھلا اعلانِ جنگ ہے۔ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (پ۳۰) "تمہارا نظامِ زندگی تمہارے لئے اور میرا نظامِ زندگی میرے لئے"۔ اس لئے تم میں اور مجھ میں نہ مفاہمت کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی ان دونوں نظاموں میں کوئی قدر مشترک نکل سکتی ہے۔

ان آیات اور ان جیسی سینکڑوں دیگر آیات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ لا الٰہ الا اللہ اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ اسلام کی اساس اور بنیاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔

اس مقام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تو ہمارے سامنے نہیں آتا اس لئے اس کی محکومیت اختیار کس طرح کی جائے؟ اس کے جواب میں بھی قرآن کریم نے حکومت کا ایسا تصور پیش کیا جس سے اُس زمانے کا انسان قطعاً ناآشنا تھا اور اب بھی رفتہ رفتہ اس تک پہنچ رہا ہے۔ اس زمانے میں حکومت صرف اشخاص کی سمجھی جاتی تھی۔ اشخاص کے بدلنے سے حکومتیں بدل جاتی تھیں لیکن قرآن کریم نے کہا کہ حکمرانی اشخاص کی نہیں بلکہ قانون کی ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ایک ضابطۂ قوانین دیا ہے۔ اس ضابطہ کی محکومیت

قانون کی حکمرانی

اختیار کی جائے گی تو وہ خدا کی محکومیت ہو گی۔ چنانچہ اس نے فرمایا: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ۔ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (پ۲۳) اے رسول! ہم نے تیری طرف اس ضابطۂ قوانین کو نازل کیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ اس لئے خالصتاً اس ضابطہ کی اطاعت کرو۔ یہی خدا کی عبادت یعنی محکومیت ہو گی۔ دوسری جگہ کہا: اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ

الکتاب مفصلا (۶/۱۱۵) "اے میری دعوت کے مخالفو! کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کو چھوڑ کر کوئی اور حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایسا ضابطۂ قوانین نازل کر دیا ہے جو بڑا مفصل ہے۔"

چنانچہ نبی اکرمؐ نے وہ اسلامی نظام قائم فرمایا جس میں لوگوں کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کئے جاتے تھے کیونکہ حضورؐ سے کہا گیا تھا: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)۔ حضورؐ خود اسی کتاب پر ایمان لائے تھے (۲/۲۸۵) اور اسی کا اتباع کرتے تھے۔ (۶/۵۰) (۴۶/۹)۔ اس کتاب عظیم کی خود اللہ تعالیٰ نے اس قدر خصوصیات بیان کی ہیں کہ اس خطاب میں ان کا حصر ناممکن ہے۔ ان میں سے چند ایک کے عنوانات پیش خدمت ہیں:-

قرآن کی خصوصیات

(۱) وحی خداوندی تمام کی تمام قرآن کے اندر محصور ہے اور یہی حضورؐ کے مخاطبین اور بعد میں آنے والوں کے لئے ضابطۂ ہدایت تھی اور ہے۔ (۶/۱۹) یہ ناممکن تھا کہ اس کا کوئی ایک لفظ بھی چھوٹ گیا ہو (۱۷/۸۶)۔

(۲) چونکہ یہ کتاب انسانی فکر کی تخلیق نہیں تھی اس لئے ساری دنیا کو چیلنج دے دیا گیا تھا کہ اس کی مثل ضابطۂ حیات مرتب کر کے دکھاؤ (۲/۲۳)۔

(۳) یہ اپنی ہر بات کو نکھار اور ابھار کر بیان کرتی ہے اس لئے اس میں نہ کوئی ابہام ہے نہ التباس۔ (۳۹/۲۸) (۶/۱۱۵)۔

(۴) اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (۴/۸۲) اس لئے جو لوگ اسے ضابطۂ حیات تسلیم کریں گے ان میں بھی نہ باہمی اختلاف ہوگا نہ تفرقہ۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۲)۔

(۵) یہ ہر اعتبار سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ سورۃ الانعام میں ہے: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶) (۱۸/۲۷)۔ جملہ قوانین خداوندی اس کتاب میں مکمل طور پر دے دیئے گئے ہیں۔ ان میں نہ حک و اضافہ کیا جا سکتا ہے نہ تغیر و تبدل۔ اور تو اور خود رسول اللہ کو بھی اس کا اختیار نہیں تھا کہ اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر سکتے۔ سورۂ یونس میں ہے کہ حضورؐ کی دعوت کے مخالفین آپ سے کہتے کہ ہم آپ سے مفاہمت کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ آپ اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لے آئیں یا کم از کم اس میں کچھ تبدیلی کر دیں۔ اس کے جواب میں ارشاد باری تعالیٰ ہوا: قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ "اے رسول! ان سے کہہ دو کہ مجھے اس کا اختیار ہی نہیں کہ میں اس میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکوں۔" جب یہ کتاب میری تصنیف ہی نہیں تو میں تبدیلی کس طرح کر سکتا ہوں؟ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۔ میں تو خود اس کا اتباع کرتا ہوں۔ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۰/۱۵) "اگر میں اس کی خلاف ورزی کروں تو خدا کے عذاب سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔"

(۶) اس کتاب کو مکمل اور غیر متبدل قرار دینے کے بعد اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ (۱۵/۹) اور تمام نوع انسان سے کہہ دیا کہ یہ کتاب تمہاری راہنمائی کے لئے کافی ہے (۲۹/۵۱)۔ اس کی موجودگی میں تمہیں کسی اور راہنمائی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

(۷) اور اس کے بعد واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کفر اور اسلام میں یہی مابہ الامتیاز ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ (۵/۴۴)۔

جو لوگ اس کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کریں گے تو انہیں کافر کہا جائے گا۔

یہ ہے وہ کتابِ عظیم جس کے متعلق اقبالؒ جھوم جھوم کر کہتا ہے :۔

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست ؟ — زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے، تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
پختہ تر سودائے خام از زورِ او — در فتد با سنگِ جام، از زورِ او
نوعِ انسان را پیامِ آخریں — حاملِ او رحمۃ للعالمیںؐ (اسرار و رموز ص ۱۲۴)

بات یہاں سے چلی تھی کہ انسان کے تمام نفسیاتی امراض کی جڑ اور بنیاد خوف ہے۔ خوف انسانوں کی حکمرانی سے پیدا ہوتا ہے خواہ وہ سیاسی حکومت کی شکل میں ہو اور خواہ مذہبی پیشوائیت کے پیکر میں۔ قرآن مجید انسانی حکومت کے تصور کو ختم کر کے خوف اور حزن کی جڑ کو کاٹ دیتا ہے۔ یہ مقام اس وقت حاصل ہوگا جب انسان خدا کی کتاب کی ایسی حکومیت اختیار کرے جس میں انسانی فکر اور جذبات کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس پورے پروگرام کو قرآن مجید نے ایک آیت میں نہایت جامعیت سے سمو کر بیان کر دیا جب کہا :۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُونُوا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (۳/۷۸)۔

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اس کی حیثیت مقننہ کی ہو یا انتظامیہ کی حتیٰ کہ اسے نبوت کا منصب بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ آؤ ہم اور تم سب مل کر خدا کی کتاب کے اتباع سے اللہ کے محکوم بن جائیں۔

توحید

اسی کو توحید کہا جاتا ہے جو اسلام یعنی نظامِ خداوندی کی اصل اور بنیاد ہے۔ توحید کا عملی مفہوم یہ ہے کہ دنیا کی ہر انسانی حکومت سے منہ موڑ کر صرف اللہ کی کتاب کی حکومیت اختیار کی جائے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :۔

جب توحید ایک عملی نظام کی شکل اختیار کرلے تو اس کا لازمی نتیجہ مساوات، محکمیت اور آزادی ہوگا۔ اسلام نہ کسی انسان کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے نہ مذہبی پیشواؤں کے مبیّنہ الوہیاتی اقتدار کو۔ (انگریزی خطبات ص ۱۵۴)

وہ رموزِ بیخودی میں توحید کے متعلق کہتے ہیں :۔

دیں ازو، حکمت ازو، آئیں ازو — زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو
قدرتِ او برگزیند بندہ را — نوعِ دیگر آفریند بندہ را
بیم و شک میرد، عمل گیرد حیات — چشم می بیند ضمیرِ کائنات
چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود — کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود

کتاب اللہ کی حکومت میں خوف اور حزن کس طرح کافور ہو جاتا ہے، ہمارے صدرِ اوّل کی مجموع تاریخ اس کی مثالوں سے عالمتاب ہے۔ میں اس سلسلے میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا جو واقعاتی لحاظ سے تو معمولی سی ہیں لیکن ہمارے مقصدِ پیشِ نظر کے اعتبار سے بڑی ہی اہم ہیں۔ مدینہ میں برسرہ نامی ایک لونڈی تھی۔ جس نے اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے خاوند کی درخواست پر حضورؐ نے اس سے کہا کہ وہ اپنے خاوند کو نہ چھوڑے۔ آپ سوچیے کہ یہ کہنے والا کون ہے اور جس سے کہا جا رہا ہے وہ (ہمارے مروّجہ تصوّر اور معیار کے مطابق) کس حیثیت کی مالک ہے؟ کہنے والا سربراہِ مملکت بھی ہے اور خدا کا رسول بھی، اور جس سے کہا جا رہا ہے وہ اس کی رعیت بھی ہے اور اس پر ایمان لانے والی بھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضورؐ کی سفارش کے جواب میں اس نے کیا کہا؟ اس نے پوچھا کہ یہ خدا کا حکم ہے جسے آپؐ مجھ تک پہنچا رہے ہیں یا آپؐ کی اپنی سفارش۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ خدا کی وحی نہیں۔ میرا ذاتی مشورہ ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ پھر معاف فرمائیے! میں آپؐ کا مشورہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ میں اپنے معاملات کو بہتر سمجھتی ہوں۔ ایسا کہنے سے نہ تو اس کے دل میں ایک سربراہ مملکت کی حکم عدولی سے کوئی خوف پیدا ہوا، اور نہ ہی خدا کے رسول کی معصیت کے احساس سے کسی قسم کا حزن۔

دوسری مثال اس واقعہ کی لیجئے جس کی رو سے حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں یہ چاہا کہ مہر کی کوئی انتہائی حد مقرر کر دی جائے۔ جب انہوں نے اپنی اس تجویز کو مجمع کے سامنے پیش کیا تو ایک بڑھیا نے اٹھ کر کہا کہ عمرؓ خدا کا خوف کرو۔ خدا کا ارشاد تو یہ ہے کہ تم چاہو تو مہر میں سونے کا ڈھیر بھی دے سکتے ہو۔ تمہیں خدا کے اس حکم پر حد بندی کا اختیار کیسے حاصل ہو گیا؟ یہ سن کر سربراہِ مملکت نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں اور معذرت سے کہا کہ محترمہ! مجھے معاف رکھنا۔ قرآن کا یہ ارشاد میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

یہ ہیں وہ جرأتیں اور بیباکیاں جو انسانوں کے دل میں توحید سے پیدا ہوتی ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ جیسا کہ واضح ہے، قرآن کریم نے نظامِ خداوندی کا منتہیٰ یہ بتایا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔

خدا کا خوف

لیکن قرآن مجید میں خدا کے خوف کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ خوف کے معنے کسی آنے والے خطرے کے احساس سے اس سے محتاط رہنے کے بھی ہیں۔ مثلاً یہ ڈر کہ اگر میں نے آگ میں ہاتھ ڈال دیا تو اس سے ہاتھ جل جائے گا اور مجھے بڑی تکلیف ہوگی اس لئے مجھے آگ کے قریب نہیں جانا چاہیئے۔ احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کے خوف سے یہی مراد ہے۔ یعنی اگر میں نے ان کی خلاف ورزی کی تو اس سے مجھے بڑا نقصان پہنچے گا۔ اس لئے مجھے بڑی احتیاط برتنی چاہیئے۔ یہ احتیاط ہر قسم کے خوف سے محفوظ اور مامون کر دیتی ہے۔ اقبالؒ نے خوف یا حزن کے ان سرچشموں میں بڑا نازک سا فرق بتایا ہے جب کہا ہے:۔

یک غم است آن غم کہ آدم را خورد آن غمِ دیگر کہ ہر غم را خورد (زبورِ عجم۔ صـ۲۵۲)

یعنی ایک غم وہ ہے جو انسان کو کھا جاتا ہے (یہ انسانی حکومت کا خوف اور مذہبی پیشوائیت کا حزن ہے) اور دوسرا غم وہ ہے جو ہر قسم کے غم کو کھا جاتا ہے (یعنی احکامِ خدا۔ ندی کی خلاف ورزی سے بچنا۔ اسے تقویٰ کہتے ہیں) اس فرق کو

حفیظ ہوشیارپوری (مرحوم) نے غزل کے انداز میں بڑی دلکشی سے بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ

زمانے بھر کے غم، یا اک تمہارا غم — یہ غم ہوگا تو کتنے غم نہ ہوں گے!

اور اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے — ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

خدا نے اپنی طرف کہیں بھی حزن کا لفظ منسوب نہیں کیا۔ خوف کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، خوف، قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی سے پیدا ہونے والے نقصان کے احساس کا نام ہے۔ خدا نے اپنے ہر قانون کے سلسلہ میں وضاحت کر دی ہے کہ اس نے ایسا قانون کیوں بنایا ہے۔ یعنی اس کی توجیہہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس کے برعکس، حزن، لاقانونیت کی طرف سے پہنچنے والی اذیت کے احساس کو کہا جاتا ہے جس کی کوئی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اور قانونِ خداوندی کے برعکس، انسانوں کا وضع یا نافذ کردہ ہر قانون، عدالتِ خداوندی میں لاقانونیت کے زمرے میں آتا ہے۔

قرآن مجید کی اس پوزیشن کے تعین کے بعد آپ غور کیجئے کہ یہ نوعِ انسان کے لئے کس قدر عظیم نعمت بن جاتا ہے! آپ ایک قوم سے کہتے ہیں کہ اس کتاب کو دیکھئے۔ یہ ہمارے لئے آئینِ حیات اور ضابطۂ قوانین ہے۔ آپ اسے دیکھئے اور اچھی طرح پرکھئے۔ اگر آپ اس سے مطمئن ہوں تو ہمارے ساتھ شامل ہو جائیے۔ وہ قوم آپ سے کہتی ہے کہ ہمارا اس پر اطمینان تو ضرور ہے لیکن حکومتیں آئے دن بدلتی رہتی ہیں۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ کل کو کوئی اور حکومت آجائے اور وہ اس میں ردوبدل کر دے۔ آپ اس سے کہتے ہیں اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں کوئی شخص کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس پر وہ کہتی ہے کہ یہ مانا کہ اس میں کوئی حکومت تبدیلی نہیں کرے گی لیکن کل کو کوئی نبی آجائے تو وہ تو اس میں تبدیلی تو ایک طرف، اس کی جگہ کوئی دوسرا ضابطۂ قوانین لا سکتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب وہ ہے جس نے مذاہب کی دنیا میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ہے۔ وہ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نبوت ختم کر دیا ہے اس لئے اب کوئی مامور من اللہ نہیں آئے گا۔ لہٰذا، یہ قرآن تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک کے لئے غیر متبدل اور آخری ضابطۂ قوانین رہے گا۔

ختمِ نبوت

ختمِ نبوت کا اعلان فی الواقعہ ایک عظیم انقلاب کا اعلامیہ ہے۔ علامہ اقبالؒ اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

> اسلام کا ظہور استقرائی فکر (INDUCTIVE INTELLECT) کا ظہور ہے۔ اس میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لئے عہدِ طفولیت کی ڈوریوں سے باندھے نہیں رکھا جا سکتا۔ انسان کو شعورِ خویش کی منزل تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے اس کی اپنی صلاحیتوں کے سہارے پر چھوڑ دیا جائے۔ اسلام نے مذہبی پیشوائیت اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن مجید غور و فکر اور تجربات و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علم انسان کے ذرائع ٹھہراتا ہے یہ سب ختمِ نبوت کے نظریہ ہی کے مختلف گوشے ہیں ..... عقیدۂ ختمِ نبوت کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اب نوعِ انسان کی تاریخ میں کوئی شخص اس کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی فوق الفطرت اتھارٹی

کی بناء پر دوسروں کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا ہے۔ ختم نبوت کا عقیدہ ایک ایسی نفسیاتی قوت ہے جو اس قسم کے دعوائے اقتدار کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ (پانچواں خطبہ۔ ص۱۲۶)

وہ اپنے چھٹے خطبے کے خاتمے پر کہتے ہیں :-

اس عقیدہ کی حامل قوم کو دُنیا میں سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ (ص۱۸۰)

عقیدۂ ختم نبوت کی حکمت قرآن کے اس اعجاز پر ہے کہ اس کے اصول و اقدار میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر زمانے کے بدلنے والے انسانی تقاضوں کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں :

چون مسلمانان اگر داری جگر — در ضمیر خویش و در قرآن نگر
صد جہان تازہ در آیات اوست — عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
یک جہانش عصر حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیات خداست — ہر جہاں اندر بر او چون قباست
چون کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش (جاوید نامہ۔ ص۳۰-۴۲)

ختم نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو اس کتاب کا وارث قرار دیا (۳۵/۳۲) اور ان سے کہا کہ جو اصول اور اقدار اس میں دیئے گئے ہیں ان پر عمل درآمد کے طور طریق اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے خود طے کر لیا کرو (۴۲/۳۸)۔ یہی حکم خود رسول اللہ کو بھی دیا گیا تھا (۳/۱۵۸)۔ یہ اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل درآمد کے طور طریق، جو باہمی مشاورت سے طے پائیں، زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے چلے جائیں گے۔ اس طرح ثبات اور تغیر کے اس امتزاج سے حکومت خداوندی ہمیشہ کے لئے قائم رہے گی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟

اسلام کے صدر اوّل میں یہ حکومت اسی طرح قائم ہوئی تھی اس کے بعد کیا ہوا؟ اسے اقبالؒ کے ان بصیرت افروز الفاظ میں سنیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ

نقش قرآن تا درین عالم نشست — نقشہائے کاہن و پاپا شکست (جاوید نامہ۔ ص۹)

اس کے بعد اس قوم نے کیا کیا؟

خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست — خود سر تخت ملوکیت نشست!
تا نہال سلطنت قوت گرفت — دین او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر! (جاوید نامہ ص۵۵)

یعنی سب سے پہلے ہم نے وراثتی بادشاہت کو قائم کر لیا۔ ہماری تاریخ کی یہ بوالعجبی جہاں انتہائی حزن انگیز ہے وہاں اتنی ہی بڑی حیرت انگیز بھی ہے۔ یزید کے خلاف انتہائی سنگین جرم یہ عائد کیا جاتا ہے کہ اس نے وراثتی بادشاہت کی طرح ڈال کر اسلام کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ لیکن یہ حقیقت کس قدر تعجب انگیز ہے کہ یزید کے بعد ہماری تاریخ میں

تمام بادشاہتیں اسی طرح قائم ہوئیں جس طرح یزید کی بادشاہت کے متعلق کہا جاتا ہے۔ اس میں ناقابلِ فہم اور انتہائی تعجب انگیز بات یہ ہے کہ جو مذہبی پیشوائیت یزید کے خلاف، یہ جرم عائد کرتی ہے، وہ اس کے بعد اسی انداز سے برسرِ اقتدار آنے والے بادشاہوں کے نام خطبوں میں پکارتی اور ان کے حق میں تائید و نصرتِ خداوندی کی دعائیں مانگتی چلی آ رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ فخریہ دعوے کیا جاتا ہے کہ اس تمام دوران میں اسلام اپنی تابانیوں کے ساتھ مسلسل آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے؟ سوچئے کہ کیا اسلام اور موروثی بادشاہتیں کبھی یکجا رہ سکتی ہیں؟

متوازی حکومتیں

آپ کو شاید اس پر حیرت ہو کہ خدا کی حکمرانی کے متعلق قرآن کریم کے ایسے واضح ارشادات کی موجودگی میں انسانی بادشاہت کو کیسے روا رکھا گیا؟ ہم نے دیکھا ہے کہ حکومتِ خداوندی کی بنیاد لا الٰہ الا اللہ پر تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ انہوں نے الٰہ کا ترجمہ معبود کیا اور معبود کے معنے بتائے "جس کی پرستش کی جائے" اس کے ساتھ ہی عبادت کے معنے بھی پرستش کر دیئے۔ لہٰذا، لا الٰہ الا اللہ کے معنی ہو گئے "خدا کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی پرستش کی جائے" اور ایاک نعبد کے معنے یہ کہ ہم صرف تیری پرستش کرتے"۔ یعنی پرستش خدا کی اور حکومت بادشاہوں کی! اور ان بادشاہوں کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ "السلطان ظل اللہ علی الارض" "بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے"۔ بادشاہوں نے اس کے معاوضہ میں یہ سمجھوتہ کر لیا کہ دنیاوی امور کے متعلق تو ہماری حکومت ہو گی اور امورِ شریعت کے متعلق مذہبی پیشواؤں کے احکام نافذ ہوں گے۔ یوں ایک مملکت میں دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں اور اُمت چکی کے ان دو پاٹوں میں پستی چلی گئی اور ان کا قلب خوف و حزن کا مامن بنتا چلا گیا۔ اس کے بعد آپ تحقیقاتی کمیشن بٹھاتے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ قوم میں اس قدر اخلاقی زمائم کیوں پیدا ہو گئے ہیں؟ صدیوں کے اس خوف و حزن کا نتیجہ اخلاقی زمائم نہیں ہوں گے تو اور کیا ہو گا؟

یہ تو رہا سیاسی حکومتوں کا قصہ۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں مذہب کی دنیا میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آ گئی؟ یہ وہ مقام ہے جہاں پاؤں رکھتے ہوئے (محاورے کی زبان میں) فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ مذہبی پیشوائیت کی کیفیت یہ ہے کہ ان سے متعلق کسی معاملہ پر تنقید کیجئے تو، اس پر خود ٹھنڈے دل سے غور کرنا تو درکنار، وہ ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ اس پر کوئی بھی غور و فکر کی جرأت نہ کر سکے۔ وہ اپنے شور انگیز پراپیگنڈے سے عوام کو اس طرح مشتعل کر دیتے ہیں کہ غور و فکر کی تمام گنجائشیں مسل کر رہ جاتی ہیں۔ میں آپ سے عصوصیت سے درخواست کروں گا کہ جو کچھ میں اب پیش خدمت کرنے والا ہوں آپ اس پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے۔ میں شروع ہی میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی کے عقیدے کو زیرِ بحث نہیں لاؤں گا۔ صرف واقعات تک محدود رہوں گا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ وحی خداوندی یہ تمام و کمال قرآن مجید کے اندر جمع ہو گئی۔ خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا اور اس طرح دین کی تکمیل ہو گئی۔ لیکن بعد میں یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی خداوندی تمام کی تمام قرآن مجید میں درج نہیں ہوئی۔ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک قسم کی وحی قرآن مجید میں درج ہوئی۔ دوسری قسم کی وحی احادیث میں۔ یہ دونوں قسم کی وحییں قرآن ہی میں کیوں نہ جمع کر دی گئیں اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کے برابر ضخیم ہو جاتا۔ (تفہیمات۔ حصہ اوّل۔ صـ۲۳۶)

وحی کا یہ حصّہ اُمّت تک کس طرح پہنچا یہ بات غور طلب ہے۔ اس مجموعے کو مرتب کر کے نہ تو رسول اللہ نے اُمّت کو دیا اور نہ ہی صحابہ کرامؓ نے ایسا کیا۔ تقریب دو سو سال بعد ایران کے کچھ ارباب تجسس و تحقیق اٹھے اور لوگ جن زبانی روایات

احادیث کے مجمُوعے

کو رسول اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے انہیں ان سے سن کر جمع کرنا شروع کیا۔ یہ لاکھوں کی تعداد میں تھیں۔ انہوں نے ان میں سے چند ہزار کو قابلِ قبول قرار دیا اور باقی لاکھوں روایات کو مسترد کر دیا۔ مثلاً امام بخاریؒ نے چھ لاکھ روایات میں سے (مکررات کو نکال کر) صرف دو ہزار ساٹھ باسٹھ روایات کو قابلِ قبول قرار دیا۔ اسی طرح امام مسلمؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ اور نسائیؒ نے بھی لاکھوں کے ڈھیر میں سے چند ہزار روایات کو قابلِ قبول قرار دے کر اپنے اپنے مجموعے تیار کئے۔ سنیوں کے ہاں ان چھ مجموعوں کو احادیث کی صحیح ترین کتابیں تسلیم کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان جامعین حدیث کے پاس وہ کون سا ذریعہ اور کون سی اتھارٹی تھی جس کی بناء پر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ روایات ٹھیک ٹھیک رسول اللہ کی ہیں اور یہ وضعی، اس لئے مسترد کر دینے کے قابل! ظاہر ہے کہ انہیں تو اس کا علم اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اور نہ ہی ان کے مجموعوں کی تصدیق رسول اللہ نے فرمائی۔ وہ انسان تھے اور انہوں نے یہ فیصلہ بہر حال اپنے خیال کے مطابق کیا تھا۔

جب احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ جن راویوں کا ذکر احادیث میں آتا ہے ان کے متعلق تحقیق کیا جانا چاہیے کہ وہ قابلِ اعتماد تھے یا نہیں۔ اسے اسماء الرجال کا فن کہا جاتا ہے۔ اس فن کے ماہرین نے دو سو سال پہلے کے گزرے ہوئے انسانوں کے متعلق تحقیق کرنا شروع کیا کہ وہ کس حد تک قابلِ اعتماد تھے۔ اس قسم کی تحقیق کے بعد احادیث کے مختلف مدارج مقرر کئے گئے ــــ صحیح، حسن، ضعیف، مرفوع، موقوف، وغیرہ۔ ہزار برس سے یہ مجموعے اسی طرح چلے آ رہے تھے کہ ہمارے زمانے میں ایک صاحب نے یہ دعوےٰ کیا کہ احادیث کے پرکھنے کے یہ طریق اور ذرائع قابلِ اعتماد نہیں۔ اس کے لئے ایک اور ذریعہ ہے جس کی رُو سے حتم و یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کون سی حدیث رسول اللہ کی ہے اور کون سی ایسی نہیں۔ وہ ذریعہ یہ ہے کہ

مزاج شناسِ رسولؐ

جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے ..... اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کون سی نہیں رکھتی ..... وہ شخص نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ اس میں سے کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے ..... یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سُنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبیؐ کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔

یہ ارشادِ گرامی ہے سید ابوالاعلےٰ مودودی صاحب کا جسے انہوں نے اپنی کتاب تفہیمات جلد اوّل (صفحہ ۳۲۲-۳۲۳) پر تحریر فرمایا ہے۔ اس معیار کی رو سے آپ کو "مزاج شناسِ رسولؐ" کی نگہ بصیرت پر ایمان لانا ہوگا یعنی یہ ماننا پڑے گا کہ جس بات کے

متعلق وہ کہہ دے کہ وہ ارشادِ نبوی ہے وہ رسول اللہ کی حدیث ہے۔

یہ ہے ان احادیث کی تاریخ لیکن ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے:۔

تحقیق و تنقید کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا .... جو احادیث قواعد صحیحہ اور آئمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث ص۴۹ از مولانا محمد اسماعیل مرحوم سابق صدر جمعیت اہل حدیث)

"کفر اور ملت سے خروج" کے الفاظ سے آپ یونہی آگے نہ بڑھ جائیے جس شخص پر کفر اور ملت سے خروج کا فتویٰ عائد کیا جائے اسے مرتد قرار دے دیا جاتا ہے اور مرتد کی سزا قتل ہوتی ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ان احادیث میں سے کسی ایک حدیث کے انکار کا عملی نتیجہ کیا ہوگا؟ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے میں اس وقت عقائد سے بحث نہیں کروں گا۔ میں بخاری شریف سے دو ایک ایسی حدیثیں پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا جن کا تعلق معلوماتِ عامہ سے ہے۔ ایک حدیث ہے:۔

بخاری کی احادیث

نبی نے ابوذر سے جب کہ آفتاب طلوع ہو رہا تھا، یہ فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ یہ کہاں جاتا ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول خوب واقف ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ جاتا ہے تاکہ عرش کے نیچے سجدہ کرے۔ پھر اللہ سے اجازت طلوع کی مانگے گا تو اسے اجازت طلوع کی دی جائے گی۔ اور قریب ہے کہ وہ سجدہ کرے اور اس کا سجدہ قبول نہ کیا جائے اور اجازت مانگے اور اسے اجازت نہ ملے۔ اس سے کہہ دیا جائے کہ جہاں سے تو آیا ہے وہیں لوٹ جا پس وہ مغرب سے طلوع کرے گا۔

(بخاری اردو ترجمہ۔ جلد دوم۔ ص۱۰)

بخاری شریف ہی کی ایک دوسری حدیث ہے کہ

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی کہ اے میرے پروردگار! میرے ایک حصہ نے میرے دوسرے حصے کو کھا لیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سانس جاڑوں میں اور ایک سانس گرمی میں۔ پس تم جو سخت سردی دیکھتے ہو یہ بھی جہنم کا سانس ہے۔ (بخاری اردو ترجمہ۔ جلد دوم۔ ص۱۳۲)

اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ سورج کا طلوع و غروب اور موسموں کا تغیر و تبدل زمین کی گردش کی وجہ سے ہوتا ہے تو اس سے ان احادیث کا انکار لازم آئے گا۔ اس انکار کا نتیجہ کفر اور ملت سے خروج ہوگا جس کا نتیجہ ارتداد اور ارتداد کی سزا قتل ہے۔ اس سے آپ خوفناک نتائج کا اندازہ لگا لیجئے۔

جہاں تک احکامِ شریعت کا تعلق ہے، عقیدہ یہ ہے کہ احادیث میں جو احکام درج ہیں وہی اسلامی احکام ہیں اور ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی حدیث ایسی ہو جو قرآن کے کسی حکم کے خلاف ہو تو حکم حدیث کا نافذ ہوگا قرآن کا نہیں کیونکہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ (فتنۂ انکار حدیث از علامہ حافظ محمد ایوب مرحوم ص۶۸)

حدیث سے آگے بڑھ کر فقہ کی طرف آئیے۔ بعض قانون دان حضرات نے یہ کہا کہ قرآن نے ایک طرف جو احکام احادیث

میں بھی درج ہیں وہ بھی زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے خود قوانین وضع کئے اور کہا کہ قرآن اور حدیث کے تمام احکام ان قوانین کے اندر آ گئے ہیں۔ اور یہ اسلام کے لئے کافی ہیں۔ انہیں ائمہ فقہ کہتے ہیں جن میں سے چار کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یعنی امام ابوحنیفہؒ۔ امام مالکؒ۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ۔ ان فقہی قوانین کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ یہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ان میں ایسے قوانین بھی ہیں جو قرآن

فقہ

کے بھی خلاف ہیں اور بعض احادیث کے بھی خلاف۔ اس سلسلے میں عقیدہ یہ ہے کہ حکم بہرحال فقہ کے قوانین کا نافذ ہوگا۔ چنانچہ فقہ حنفی کے ایک مسلم امام ابوالحسن علیہ اللہ الکرخیؒ کا قول ہے کہ

> ہر وہ آیت جو اس طریقے کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو مئوّل ہے یا منسوخ۔ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ بھی مئوّل یا منسوخ ہے۔
>
> (تاریخ فقہ اسلامی ۔ شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ صفحہ ۲۳)

ہمارے ہاں حال ہی میں جو چند قوانین "شرعی حدود" کے نام سے نافذ کئے گئے ہیں ان کا تعلق فقہ حنفی سے ہے۔ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ یہاں پوری کی پوری فقہ حنفی کو پبلک لاء کے طور پر نافذ کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ شیعہ حضرات کے احادیث کے مجموعے بھی الگ ہیں اور ان کی فقہ بھی الگ۔ وہ فقہ حنفی کو تسلیم نہیں کرتے۔ سنیوں میں اہل حدیث بھی فقہ حنفی کو تسلیم نہیں کرتے۔ دیوبندی اور بریلوی دونوں حنفی ہیں لیکن ان کے باہمی اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز تک نہیں پڑھتے۔

فقہ کے یہ احکام انسانوں کے مرتب کردہ ہیں لیکن جب یہ نافذ ہوئے تو مودودی صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ اب ہمارا فریضہ یہ ہے کہ

> عوام الناس کو یہ احساس دلائیں کہ اب یہاں خدا کا قانون جاری کیا جا رہا ہے (ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۷۹ء صفحہ ۱۳)

آپ نے دیکھا کہ مذہبی پیشوائیت کس طرح اپنے فیصلوں کو خدا کے قوانین کہہ کر نافذ کرتی ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے دوسرے مقام پر کہا۔

> انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور چیز ہے اور خدا تعالیٰ اور رسولؐ کے قانون کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔
>
> (ایشیا، مورخہ ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء صفحہ ۹)

دنیاوی سزا بھی اور خدا کا غضب بھی! آپ نے خوف اور حزن کی شدت کا اندازہ لگایا؟

یہ ہے وہ مقام جس پر امت آج کھڑی ہے۔ آج ہی نہیں بلکہ وہ صدیوں سے اسی راستے پر گامزن ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ حکومت صرف خدا کی ہوگی جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ اس کی کتاب ہے۔ کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن ہمارے ہاں کیفیت یہ ہے کہ سیاسی حکومت ہو یا مذہبی پیشوائیت، ان میں قرآن کریم کا کوئی عمل اور دخل نہیں۔ سب انسانوں کے مرتب کردہ قوانین ہیں اور وہ بھی ہزار برس پہلے کے۔ انسانوں کے ان وضع کردہ احکام شریعت سے خوف اور حزن کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے میں اس کی صرف ایک مثال پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ ایک شخص غصے

کی حالت میں اپنی بیوی سے کہہ دیتا ہے طلاق، طلاق، طلاق۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا غصّہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو وہ مولوی صاحب کے پاس فتویٰ لینے کے لئے جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تمہارا نکاح ٹوٹ چکا ہے۔ اب اس کا حل اس کے سوا کوئی نہیں کہ تمہاری بیوی کسی دوسرے شخص سے نکاح کر کے اس کے ساتھ رات بسر کرے۔ پھر وہ اسے طلاق دے

طلاق۔ طلاق۔ طلاق

دے تو تمہارے ساتھ اس کا دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ اس فتویٰ سے اس خاوند پر جو گزرتی ہے اسے تو چھوڑیئے۔ اس بے گناہ بیوی کی کیفیت کو سامنے لائیے۔ میرے پاس اس قسم کے میاں بیوی اکثر آتے رہتے ہیں۔ وہ عصمت مآب خاتون پانچ بچوں کی ماں ہے۔ سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ اور اس فتوے کے تصور سے اس پر غش کے دورے پڑ رہے ہیں۔

بیوی پر طلاق پڑنے کی صورت یہی نہیں کہ خاوند طلاق، طلاق، طلاق کہہ دے۔ ان حضرات کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ جس شخص کے خلاف یہ کفر کا فتویٰ صادر کر دیں اس کی بیوی پر از خود طلاق پڑ جاتی ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ تمام مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کوئی فرقہ ایسا نہیں جس پر کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو۔ اس معیار کی رو سے دیکھئے تو دنیا میں کوئی مسلمان ایسا نہیں رہتا جس کی بیوی پر طلاق نہ پڑ چکی ہو۔ یہ بات فرقوں تک محدود نہیں۔ مشاہیرِ اُمّت میں سے بھی شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کے خلاف کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو۔ مثلاً قائد اعظم محمد علی جناح کو لیجئے۔ مجلسِ احرار کے مولانا مظہر علی اظہر اور دیوبند کے مولانا حسین احمد مدنی نے انہیں کافرِ اعظم کے فتویٰ سے نوازا۔ بریلوی فرقہ نے تفصیلی فتویٰ صادر فرمایا جس میں کہا:۔

> بحکم شریعت مسٹر جناح اپنے ان عقائد کفریہ، قطعیہ، خبیثیہ کی بناء پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔ جو شخص اس کے کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اس کے کافر و مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر و مرتد اور شرالانام اور بے توبہ مرا تو مستحق لعنتِ عزیز العلام ہے۔
>
> (تجانب اہل السنہ ص ۱۲۲)

یہ تو رہا قائد اعظمؒ کا (معاذ اللہ) کافر اور مرتد ہونا۔ اس کے بعد دوسرے فتویٰ میں کہا گیا کہ جو شخص قائد اعظمؒ کو کافر اور مرتد نہ سمجھے اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل گئی۔ (فتویٰ مبارکہ مرکزی انجمن حزب الاحناف ہند لاہور)

ان مثالوں سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی کا کیا عالم ہے اور اس کے تابع اُمّت کس قسم کے جگر سوز خوف اور حزن کا شکار چلی آ رہی ہے۔ ان کے اس قسم کے فتوے احکامِ خداوندی کے یکسر خلاف ہیں۔ آپ سوچئے کہ جو قوم اتنی صدیوں سے ایک طرف موروثی بادشاہوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی چلی آ رہی ہو اور دوسری طرف اس قسم کے احکامِ شریعت کی پابندیوں میں محصور، اس کی قلبی اور ذہنی کیفیت کس قسم کی ہوگی اور وہ کون سا نفسیاتی مرض ہوگا جس کا وہ شکار نہ ہوگی؟ اقبالؒ نے اُمّت کے اس بنیادی مرض کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت ۔۔۔ حریت را زہر اندر کام ریخت (اسرار و رموز ص ۱۲۵)

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

ہماری نگوں حالی

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق! ۔۔۔ مومن و غداری و فقر و نفاق!

با پشیزے دین و ملت را فروخت ۔۔۔ ہم متاعِ خانہ و ہم خانہ سوخت

لا الٰہ اندر نمازش بود و نیست   ناز ہا اندر نیازش بود و نیست
نور در صوم و صلوٰتِ او نماند   جلوۂ در کائناتِ او نماند
روح چوں رفت از صلوٰت و از صیام   فرد ناہموار و ملّت بے نظام
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی   از چنیں مرداں چہ اُمید بہی
ہر کسے بر جادۂ خود تند رَو   ناقہ ما بے زمام و ہرزہ دَو   (جاوید نامہ صـ ۲۳۵)

سوال یہ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ قرآنِ کریم نے اپنے آپ کو "شفاء لما فی الصدور" کہا ہے۔ لہٰذا، اگر ہمارا اس پر ایمان ہے تو یہی ہمارے لئے نسخۂ شفا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی   علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی   (بالِ جبریل)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں ؎

گر تو میخواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن

"جز بقرآں" کے معنے الا اللہ کے ہیں۔ لیکن جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے الا اللہ تک پہنچنے سے پہلے لا الٰہ لاینفک ہے۔ یعنی انسانوں کے وضع کردہ تمام آئین و دساتیر، قوانین و احکام سے قطع نظر خالص کتاب اللہ کی حکومیت۔ آپ دیکھئے کہ

اس کا علاج

قرآنِ کریم میں اس حقیقت کو کیسے محاکاتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ حشر کا میدان ہے۔ تمام قومیں ایک ایک کر کے اپنے اپنے رسول کے زیرِ شہادت بارگاہِ خداوندی کے سامنے سے گزر رہی ہیں۔ جب ہماری باری آتی ہے تو حضور نبی اکرمؐ پکار کر کہتے ہیں۔ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰) "اے میرے رب! یہ ہے میری وہ قوم جس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا"۔ دیکھئے! رسول اللہؐ یہ نہیں فرماتے کہ میری امت نے بخاری اور مسلم کو چھوڑ دیا تھا یا ہدایہ اور در المختار (فقہ کی کتابوں) کو۔ وہ فرماتے ہیں تو یہ کہ اس قوم نے قرآن کو ترک کر دیا تھا۔ حضورؐ نے اپنی امت کو قرآن ہی سے متمسک رہنے کی تاکید فرمائی تھی اور آپ قرآن ہی کو ترک کرنے والوں کے خلاف الزام عائد کریں گے۔ اس لئے امت کے امراض کے ازالے کی صورت قرآن ہی سے متمسک ہونے میں ہے۔ تمسک بالقرآن کے یہ معنے نہیں کہ ہمارے ہاں فقہ اور حدیث کا جو ذخیرہ چلا آ رہا ہے (معترضین کے الفاظ میں) اسے دریا برد کر دیا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ دین میں سند اور حجت خدا کی کتاب کو تسلیم کیا جائے اور اسی کو غلط اور صحیح کا معیار قرار دیا جائے۔ اس کے غیر متبدل قوانین و اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، ان پر عمل پیرا ہونے کے طریق اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے خود مرتب کئے جائیں اور ایسا کرنے میں اس تمام لٹریچر سے مدد لی جائے جو ہمارے ہاں متوارث چلا آ رہا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے رہنمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔ (چھٹا خطبہ صـ ۱۶۸)

شریعت کے معنی

ہمارے ہاں شریعت کا لفظ تو ہر ایک کی زبان پر ہوتا ہے لیکن اس کے معانی پر کبھی غور نہیں کیا جاتا۔ عربی زبان میں شریعت اس راستے کو کہتے ہیں جو پانی کے گھاٹ کی طرف لے جائے لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ وہ پانی بہنے والا (آبِ رواں) ہو۔ ایک مقام پر ٹھہرا ہوا (جوہڑ یا تالاب) نہ ہو۔ اگر پانی ساکن ہے تو عرب اس راستے کو شرع نہیں کہیں گے، کرع کہیں گے۔ لہٰذا جو طریقِ عمل جامد ہو کر رہ جائے اور زمانے کے رواں دواں تقاضوں کا ساتھ نہ دے اسے "شریعت" کی راہ کہا ہی نہیں جائے گا۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم کی رو سے کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو حقِ حکومت حاصل ہی نہیں۔ حقِ حکومت صرف خدا کی کتاب کو حاصل ہے اور چونکہ اس کتاب میں کسی انسان کا عمل دخل نہیں اس لئے اس کی محکومیت اختیار کرنے میں انسان ہر قسم کے خوف اور حزن سے آزاد اور مامون ہو جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمِنًا (۳/۹۷) جو اس نظامِ حکومت میں داخل ہو گیا اسے ہر قسم کا امن نصیب ہو جائے گا۔

زیرِ نظر موضوع تو اس مقام پر ختم ہو جاتا ہے لیکن آخر میں میں ایک ایسے اعتراض کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں جو مذہب گزیدہ نوجوانوں کی طرف سے اکثر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے آخری دین دیا تاکہ دنیا سے ظلم اور استحصال کا خاتمہ ہو اور انسان امن و اطمینان کی زندگی بسر کر سکے۔ لیکن کیفیت یہ ہے کہ ظلم بھی اسی طرح سے جاری ہے اور استحصال بھی۔ مظلوم آج بھی اسی طرح پس رہے ہیں اور کسی کو اطمینان نصیب نہیں۔ جب صورت یہ ہے تو پھر اس دین کا فائدہ کیا ہوا اور اسلام نے آ کر کیا کیا؟

ایک اعتراض کا جواب

اس قسم کے اعتراض کرنے والوں کے ذہن میں تصور یہ ہوتا ہے کہ اسلام کسی شخص کا نام ہے جسے خدا نے اس لئے بھیجا تھا کہ وہ ظلم و ستم کو مٹا کر عدل و انصاف رائج کر دے۔ اسلام کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں۔ جیسا کہ میں نے اس خطاب کے آغاز میں کہا ہے اللہ تعالیٰ نے کہا یہ ہے کہ ہم ایک نسخہ عطا کر رہے ہیں جس کے استعمال سے انسانیت کے امراض کو شفا مل جائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ شفا تو اسی صورت میں ملے گی جب اس نسخے کو استعمال کیا جائے۔ اگر اس نسخے کو حفاظت سے لپیٹ کر رکھ لیا جائے تو اس سے مریض کو شفا نہیں ہو سکتی۔ اعتراض اس صورت میں حق بجانب قرار پا سکتا ہے جب اس نسخے کو استعمال کیا جائے اور اس کے باوجود مریض اچھا نہ ہو۔

کہا یہ جاتا ہے کہ آج کل اسلام کے لئے دنیا میں اتنا کچھ کیا جا رہا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان افراد کو دیکھئے یا اقوام کو سب اپنی زبوں حالی کے مرثیہ خواں نظر آئیں گے۔ اس کا بھی اس کے سوا کیا مطلب لیا جائے گا کہ اسلام نوعِ انسان تو ایک طرف، خود مسلمانوں کی حالت سنوارنے میں بھی ناکام رہا ہے۔ اسے بھی ایک مثال کے ذریعے سمجھئے۔ ایک ریل گاڑی غلط کانٹا بدلنے سے دوسری پٹڑی پہ جا پڑی۔ اس ریل گاڑی کے انجن کی رفتار تیز کرنے کے لئے جو کچھ کیا جائے گا اس سے اس کی رفتار تو تیز ہو جائے گی لیکن وہ جتنی آگے بڑھے گی اتنی ہی اپنی حقیقی منزل سے دور ہٹتی چلی جائے گی۔

مسلمانوں نے جس وقت خدا کی محکومیت کو چھوڑ کر انسانوں کی محکومیت اختیار کی ان کی گاڑی غلط پٹڑی پہ جا پڑی۔ اب جو کچھ اسلام کی ترقی اور فروغ کے نام سے کیا جاتا ہے وہ غلط پٹڑی پہ پڑی ہوئی ریل گاڑی کی رفتار کو تیز کرنے میں ممد و مددگار ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس قدر یہ گاڑی آگے بڑھتی ہے قرآنی منزل سے دور ہٹتی چلی جاتی ہے۔ جب تک اس گاڑی کو اس مقام پر واپس لا کر جہاں سے یہ غلط کانٹا مڑی تھی، اسے صحیح پٹڑی پہ نہیں ڈالا جائے گا یہ اپنی منزلِ مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکے گی۔ وہ صحیح پٹڑی ہے لا الٰہ الا اللہ اور منزلِ مقصود ہے لاخوف علیہم ولا ہم یحزنون۔

اقبالؒ کے الفاظ میں :؎

بر خور از قرآں اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دہد ما را پیامِ لاتخف — می رساند بر مقامِ لاتخف

(مثنوی مسافر)

مفلسی کا حزن

میں نے اپنے خطاب میں اُس حزن کے متعلق کچھ نہیں کہا جو سب سے زیادہ دل سوز اور جگر پاش ہے۔ جو انسان کو اُس تپِ دق میں مبتلا کر دیتا ہے جس کی حرارت کوئی تھرمامیٹر ریکارڈ نہیں کر سکتا لیکن جو ہڈیوں تک کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ یہ وہ حزن ہے جس میں دنیا کی کم از کم نصف آبادی مبتلا ہے اور جس کا کوئی علاج کسی کو نہیں سوجھتا۔ یہ حزن ہے روٹی کی محتاجی کا پیدا کردہ۔ یہ بڑی معنی خیز بات ہے کہ عربی زبان میں حزن اس پریشانی کو بھی کہا جاتا ہے جو افلاس اور محتاجی کی پیدا کردہ ہو۔ چنانچہ عرب "حزانۃ الرجل" انسان کے ان متعلقین (بیوی بچوں) کو کہتے ہیں جن کی روٹی کی فکر سے وہ پریشان ہو۔ عربی لغت کی مستند کتاب تاج العروس میں ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جنت کے متعلق کہا گیا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵/۳۴) تو اس سے مراد یہ ہے کہ قابلِ حمد و ستائش وہ ذات ہے جس نے ہمیں فکرِ معاش سے نجات دلائی۔ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ (۳۵/۳۵) "اس نے ایسا نظام قائم کر دیا ہے جس میں نہ ہمیں رزق کے لئے جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں اور نہ ہی ذہنی کاوش اور نفسیاتی افسردگی کا شکار ہونا پڑتا ہے"۔ قرآنی معاشرہ میں، اس قسم کا نظام کس طرح قائم کیا جاتا ہے اس کے متعلق میں گزشتہ چالیس سال سے اس تکرار و اصرار سے لکھتا چلا آ رہا ہوں کہ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ نظامِ ربوبیت (یعنی قرآن کا معاشی نظام) میرے مشن کا بنیادی موضوع ہے۔ (اس موضوع پر میری جامع تصنیف کا نام بھی "نظامِ ربوبیت" ہے) میں اس وقت اس کے متعلق چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

(۱) اس نظام میں ہر فرد کو روٹی کی فکر آپ نہیں کرنی پڑتی۔ اس میں تمام افرادِ معاشرہ کو بنیادی ضروریات بہم پہنچانے کی ذمہ داری حکومت کی ہوتی ہے۔ وہ اعلان کرتی ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۱)۔ ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔

(۲) اس میں اجیر اور مستاجر (EMPLOYER AND EMPLEE)۔ مزدور اور کارخانہ دار، کاشتکار اور زمیندار کی آویزش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق کام کرتا ہے اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے بقدرِ اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے نظامِ مملکت کی تحویل میں دے دیتا ہے۔

(۳) اس طرح اس میں کسی کے پاس دولت جمع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ ہی جائیدادیں کھڑی کرنے کا مسئلہ۔

(۴) اس میں زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ وہ تمام انسانوں کے رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اس لئے نظامِ خداوندی اس کا ایسا انتظام کرتا ہے جس سے تمام افراد کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔

(۵) اس میں جو لوگ کسی وجہ سے محنت کرنے سے معذور ہوں انہیں خیرات نہیں دی جاتی۔ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی اپنے حق کے طور پر (AS OF RIGHT) حاصل کرتے ہیں۔ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۷۰/۲۴)

(۶) چونکہ اس نظام میں نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہوتی ہے نہ زمینوں کے مربعے، اس لئے اس میں ٹیکس (TAXES) کے مسائل پیدا ہوتے ہیں نہ ربو (سود یا منافع) کے۔ نہ زمینوں کے جھگڑے اٹھتے ہیں نہ جائدادوں کے۔ یہ تمام مسائل اس اسلام کے پیدا کردہ ہیں جو ہمارے ہاں دورِ سرمایہ داری کے زمانے میں وضع ہوا تھا۔ قرآنی نظام میں نہ کوئی بھوکا سوتا ہے نہ ضرورت سے زیادہ کھاتا۔ یوں اس نظام میں نہ کسی کو کسی قسم کا خوف ہوتا ہے نہ حزن۔ اقبالؒ نے اس نظام کی انفرادیت کو ایک شعر میں یوں بیان کر دیا ہے کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

نہ کوئی محتاج نہ سائل۔ نہ آقا نہ غلام۔ نہ حاکم نہ محکوم۔

فرمایئے! اس نظام میں خوف اور حزن کا شائبہ تک بھی باقی رہ سکتا ہے؟ اور جب خوف و حزن باقی نہیں رہتا تو ان سے پیدا شدہ نفسیاتی امراض کا خود بخود ازالہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہے معاشرہ سے اخلاقی ذمائم اور تمدنی جرائم ختم کرنے کا قرآنی نسخہ!

والسلام

ادارۂ طلوعِ اسلام کی

مطبوعات کی قیمتیں

نوٹ:۔ اِن قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (کھلے پارے)	
پارہ نمبر ۱	-/۵ روپے
پارہ نمبر ۲ تا ۲۸	-/۳ " (فی پارہ)
پارہ نمبر ۲۹	-/۴ روپے
پارہ نمبر ۳۰	-/۵ "
مکمل سیٹ (کھلے پارے)	-/۹۵ "
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ (مجلد تین جلدوں میں))	-/۱۲۰ " (فی جلد ۴۰ روپے)
لغات القرآن (مکمل سیٹ (مجلد چار جلدوں میں))	-/۱۲۰ روپے (فی جلد ۳۰ ")
تبویب القرآن (مکمل سیٹ)	-/۱۶۰ روپے
مطالب الفرقان (جلد اوّل)	-/۴۰ "
مطالب الفرقان (جلد دوم)	-/۵۰ "
مطالب الفرقان (جلد سوم)	
نظامِ ربوبیت (جدید ایڈیشن)	-/۵۰ "

نام کتاب	قیمت
قرآنی قوانین (جدید ایڈیشن)	-/۲۰ روپے
من و یزداں	-/۳۰ "
ابلیس و آدم	-/۳۰ "
جوئے نور	-/۲۵ "
برقِ طور	-/۲۵ "
شعلۂ مستور	-/۲۵ "
جہانِ فردا	-/۲۵ "
کتاب التقدیر	-/۳۰ "
معراجِ انسانیت	-/۴۵ "
شاہکارِ رسالت	-/۴۵ "
اقبالؒ اور قرآن	-/۲۵ "
انسان نے کیا سوچا؟	-/۳۰ "
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	-/۱۲ "
اسبابِ زوالِ اُمت	-/۴ "
قائدِ اعظمؒ اور طلوعِ اسلام	-/۴ "

نام کتاب	قیمت
ISLAM A CHALLENGE-TO RELIGION. (HARD BOUND)	۴۰/- روپے
ISLAM A CHALLENGE-TO RELIGION. (PAPER BACK)	۳۰/- "
سلسبیل	۱۵/- "
فردوسِ گم گشتہ	۱۵/- "
ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت (مجلد)	۱۵/- "
سلیم کے نام خطوط (مکمل سیٹ تین جلدیں)	۳۶/- "
طاہرہ کے نام خطوط	
مقامِ حدیث	۱۰/- "
اسلامی معاشرت	
قرآنی فیصلے (مکمل سیٹ تین جلدیں)	۳۰/- " (فی جلد ۱۰ روپے)
جہاد	۴/- روپے
عربی خود سیکھئے	۱۰/- "
پاکستان کا معمارِ اوّل	۴/- "
فجر الاسلام (جلد اوّل)	۵/- "

نام کتاب	قیمت
فجر الاسلام (جلد دوم)	۵/- روپے
منزل بہ منزل	۱۰/- "
قتلِ مرتد	۴/- "
عالمگیر افسانے	۱/- روپیہ
پرنسپل آف لا میکنگ ان اسلام (انگریزی)	۴/- روپے
	"
تاریخ الامت (مکمل سیٹ آٹھ جلدیں)	۳۲/- " (فی جلد ۴ ")
تصنیفات:-	
ڈاکٹر عبدالودود صاحب:-	
PHENOMENA OF — NATURE & QURAN. (HARD BOUND)	۵۰/- روپے
CONSPIRACIES — AGAINST QURAN. (HARD BOUND)	۴۰/- "
FOOD & HYGIENE — IN ISLAM. (PAPER BACK)	۸/- "

ملنے کے پتے:-

(۱) ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

(۲) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

شراب کہن

چھ خطبات

پرویز

ایک حوالہ کی تلاش میں پرانے کاغذات الٹ پلٹ رہا تھا کہ ان میں خطبات کا ایک مسودہ ملا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ یہ خطبات کب لکھے تھے اور ان کے مخاطب کون تھے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی بیس بائیس برس اُدھر کی بات ہے اور ان کا عام فہم اور سلیس اندازِ بیان اشارہ کناں ہے کہ انہیں یا تو متوسط درجہ کے طلباء کے لئے لکھا گیا تھا اور یا کم تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ان کی اشاعت کہیں نہیں ہوئی۔ مرورِ زمانہ کے باوجود، ان کی افادی حیثیت میں کچھ فرق نہیں آیا، اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ انہیں پیش خدمت قارئین کر دیا جائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا خطبہ

مستقل اقدار

قال اللہ تعالیٰ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ (البقرہ۔ آیت ۶۱)

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ کیا تم اُس چیز کو جو بہت گراں قیمت ہے اس چیز کے بدلے میں دے دینا چاہتے ہو جو انتہائی پست درجے کی ہے؟

برادرانِ عزیز! اگر آپ بازار میں کسی شخص کو دیکھیں کہ وہ سو روپے کی سونے کی انگوٹھی دس روپے میں بیچ رہا ہے تو آپ کے دل میں پہلا خیال یہ گزرے گا کہ یہ انگوٹھی اس کی اپنی نہیں، چوری کی ہے۔ اسی لئے یہ اُسے اتنے سستے داموں فروخت کر رہا ہے۔ پنجابی زبان میں ایسے موقع پر کہتے ہیں کہ "چوراں دے کپڑے تے ڈانگاں دے گز"۔ جب چوری کا کپڑا بکتا ہے تو اسے عام گزوں سے نہیں ماپا جاتا۔ اس کی پیمائش اُن گزوں سے کی جاتی ہے جن کی لمبائی لٹھ بھر کی ہو۔

لیکن اگر آپ کو اس کا بھی یقین آجائے کہ وہ انگوٹھی چوری کی نہیں۔ اُس شخص کی اپنی ہے۔ تو پھر آپ اس کے سوا کسی نتیجے پر نہیں پہنچیں گے کہ وہ شخص پاگل ہے۔ کوئی سمجھ دار آدمی ـــــ کوئی صاحب عقل و ہوش ـــــ سو روپے کی چیز کس روپے میں نہیں بیچتا۔ آپ جس سے بھی اس بات کا ذکر کریں گے وہ بلا تامل کہہ دے گا کہ وہ شخص فی الواقعہ پاگل تھا۔

لیکن جو لوگ اُس شخص کو پاگل کہتے ہیں انہوں نے کبھی اپنی حالت پہ غور نہیں کیا اور سوچا نہیں کہ وہ خود صبح سے شام تک کتنی مرتبہ اس قسم کے پاگل پن کی حرکتیں کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتنی گراں بہا چیزوں کو کتنے سستے داموں فروخت کرتے ہیں۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ وہ کون سے لوگ ہیں جو اس قسم کے پاگل پن کی حرکتیں کرتے ہیں؟ وہ کون سی بستیاں ہیں جن میں یہ لوگ رہتے ہیں؟ اگر آپ سے کہہ دیا جائے کہ وہ ہم میں سے ہی ہیں۔ اور ہماری ہی بستیوں میں بستے ہیں' تو شاید آپ اسے صحیح تسلیم کرنے پہ آمادہ نہ ہوں ـــ لیکن یہ بات ہے بالکل صحیح۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ سنئے کہ یہ کس طرح صحیح ہے:

ہمارے ہاں ایک عام محاورہ ہے ـــ اور میرا خیال ہے کہ آپ میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے اس محاورہ کا کبھی نہ کبھی استعمال نہ کیا ہو۔ یا کم از کم اسے سُنا نہ ہو۔ وہ محاورہ یہ ہے کہ ؎

مال صدقۂ جان۔ جان صدقۂ آبرو

آپ سمجھے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ مطلب بالکل واضح ہے۔ مال و دولت اچھی چیز ہے۔ اس سے دنیا میں انسان کے بہت سے کام نکلتے ہیں۔ اس سے ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اس سے انسان کھانے پینے کی چیزیں خریدتا ہے۔ بیمار ہو تو علاج کراتا ہے۔ ڈاکٹر کی فیس دیتا ہے۔ دوائیاں خرید کر لاتا ہے۔ کپڑے بنواتا ہے۔ بچوں کو تعلیم دلواتا ہے۔ یہ سب کچھ پیسے کے زور پہ ہوتا ہے۔ ہمارے ایک پرانے شاعر نے کہا ہے کہ ؎

پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

اس لئے دنیا میں پیسے کی بڑی قدر ہے۔ جو شخص پیسہ سنبھال کر رکھتا ہے اسے ہر شخص عقلمند کہتا ہے۔ جو پیسہ برباد کرتا ہے اُسے بیوقوف کہا جاتا ہے۔ لیکن زندگی میں ایسے وقت بھی آجاتے ہیں کہ جو شخص اس وقت پیسہ خرچ نہیں کرتا' اُسے سنبھال کر رکھتا ہے۔ ساری دنیا اس پہ لعنت بھیجتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کا بچہ بیمار ہے۔ اس کی حالت نازک ہو رہی ہے۔ اس شخص کے پاس بہت سارا پیسہ جمع ہے۔ لیکن وہ اپنے بچے کے علاج پہ کچھ خرچ نہیں کرتا۔ کبھی وہ اسے محلّے کے عطار کے پاس لے جاتا ہے کہ دو پیسے کے شربت میں کام بن جائے۔ کبھی وہ کسی عامل کے پاس چلا جاتا ہے کہ اس کی جھاڑ پھونک سے فائدہ ہو جائے۔ بچے کی حالت دن بدن خراب ہوتی جاتی ہے۔ ساری دنیا اُسے کہتی ہے لیکن وہ اس کے علاج پہ پیسہ خرچ نہیں کرتا۔ بالآخر بچہ جان دے دیتا ہے۔ سوچئے کہ کون ہے جو ایسے دولتمند باپ پہ لعنت نہیں بھیجے گا؟ ہر شخص اس سے کہے گا کہ میاں! ٹھیک ہے پیسہ اچھی چیز ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ اسے سنبھال کر رکھنا چاہیئے۔ لیکن بچے کی جان کے مقابلے میں تو پیسہ کوئی چیز نہیں۔ انہی باتوں کے لئے تو پیسے کو سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ مال صدقۂ جان ہوتا ہے۔ جو شخص جان بچانے کے لئے مال خرچ نہیں کرتا وہ بدبخت بخیل ہے۔ وہ انسان نہیں۔ درندہ ہے۔ جان کے مقابلے میں مال کی حیثیت کیا ہے؟

آپ نے غور کیا کہ یہ بات کیا ہوئی؟ بات بالکل صاف ہے۔ مال و دولت بیشک اپنی قیمت رکھتے ہیں لیکن جان کی قیمت' مال سے کہیں زیادہ ہے۔ جو شخص کم قیمت کی چیز یعنی مال و دولت کو سنبھال کر رکھتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ قیمتی چیز ـــ یعنی جان ـــ کو ضائع کر دیتا ہے' اُسے کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ جو شخص بڑی قیمت کی چیز کو بچانے کے لئے کم قیمت کی چیز کو قربان کر دیتا ہے' اس کی سب تعریف کرتے ہیں۔ یہی شخص عقلمند کہلاتا ہے۔

جہاں تک انسان کی اپنی جان بچانے کا تعلق ہے بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو جان بچانے کی خاطر سب کچھ نہ کر گزریں۔ انسان تو ایک طرف، حیوانوں تک بھی اپنی جان بچانے کے لئے انتہائی کوشش کر دیتے ہیں۔ چیونٹی کو دیکھئے۔ کتنی ننھی سی جان ہے۔ لیکن اس کے سامنے انگلی رکھئے اور دیکھئے کہ وہ اس خطرے سے بچنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتی۔ جان بچانے کا جذبہ ہر جاندار کے اندر قدرت کی طرف سے رکھا گیا ہے۔ کوئی ذی ہوش اپنی جان ضائع کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ خودکشی وہی کرتا ہے جس کے ہوش و حواس ٹھکانے نہ رہیں۔ جس کی عقل پر جذبات غالب آکر اُسے اندھا کر دیں۔ حیوانات کبھی خودکشی نہیں کرتے۔ غرضیکہ جان ایسی چیز ہے جسے بچانے کی خاطر انسان سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جان کی قیمت بہت زیادہ ہے ـــــ جان ہے تو جہان ـــــ ہمارے ہاں عام محاورہ ہے۔

لیکن جان کی اتنی بڑی قیمت کے باوجود، ایسے وقت بھی آجاتے ہیں، کہ جو شخص اس وقت جان بچاتا ہے اُسے ہر شخص نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جو شخص جان دے دیتا ہے، ہر شخص اس کی تعریف کرتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی درندہ انسان، کسی شریف زادی کی عصمت پر ہاتھ ڈالنا چاہے اور وہ غیرتمند خاتون اپنی عصمت بچانے کی کوشش میں اپنی جان دے دے تو اس خاتون کی جرأت اور قربانی کا ہر جگہ چرچا ہوتا ہے۔ ہر شخص تعظیم سے اس کا نام لیتا ہے۔ ہم اپنے بچوں کو بڑے فخر سے اس کی کہانی سناتے ہیں۔ اسی کا نام غیرت ہے۔ اگر کسی باپ کے ساتھ اس کی جوان بیٹی جا رہی ہو اور کوئی روسیاہ اس لڑکی کی طرف میلی نظر سے دیکھے تو غیرت مند باپ چیتے کی طرح جھپٹ کر اس کا گلا دبوچ لے گا اور اس کی قطعاً پرواہ نہیں کرے گا کہ ایسا کرنے میں اس کی جان جاتی ہے یا رہتی ہے۔ اگر بیٹی کی عصمت کی حفاظت میں وہ باپ اپنی جان دے دیتا ہے تو ساری دنیا اس کا نام تعظیم سے لیتی ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس اصول پر عمل کرتا ہے کہ ـــــ "جان صدقۂ آبرو" ـــــ آبرو کی حفاظت کے لئے جان دے دینا، شرفِ انسانیت کا تقاضا ہے۔

لیکن جہاں ہمیں ایسے باپ ملیں گے جو بیٹی کی طرف بُری نگاہ سے دیکھنے والے کا گلا دبوچ لیں گے وہاں ایسے بے غیرت انسان بھی ملیں گے جو چند روپوں کی خاطر اپنی بیٹیوں کو دوسروں کے ہاں لے جائیں گے۔ ایسے لوگوں کا شمار ذلیل ترین انسانوں میں ہوتا ہے۔ انہیں بے غیرت اور دیوث کہا جاتا ہے۔ کوئی شریف آدمی انہیں اپنے پاس بٹھانے کا روادار نہیں ہوتا۔ ان کے پاس کتنی دولت کیوں نہ جمع ہو جائے۔ اور غلط معاشرے میں وہ اس دولت کی بنا پر، اپنے لئے کوئی اونچی جگہ بھی کیوں نہ حاصل کر لیں۔ دنیا انہیں کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے گی۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے آبرو جیسی بیش بہا متاع کو مال و دولت جیسی کم قیمت چیز کے بدلے میں بیچ دیا۔ جو شخص کم قیمت کی چیز کی خاطر بڑی قیمت کی چیز کو قربان کر دیتا ہے۔ وہ انسانیت کے مقام سے گر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو سپاہی میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتا ہے وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ اس نے حق اور صداقت کی خاطر جان دینے کے بجائے، جان بچانے کو ترجیح دی۔ اس نے بہت بڑی قیمتی متاع کی حفاظت کے مقابلہ میں اُس سے کم قیمت کی چیز کو محفوظ رکھا۔ وہ دنیا کی نظروں میں ذلیل اور خوار ہو گیا۔ اس نے "جان صدقۂ آبرو" کے اصول پر عمل نہ کیا۔

لیکن ایک چیز قابلِ غور ہے۔ جہاں تک جان بچانے کا تعلق ہے، اس میں دنیا کے کسی انسان کو کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ کوئی شخص پاکستان کا رہنے والا ہو یا انگلستان کا۔ افریقہ کا حبشی ہو یا امریکہ کا سفید فام۔ جنگل میں رہنے والا

وحشی انسان ہو یا شہر کا مہذب باشندہ - ہر شخص اس سے متفق ہوگا کہ جان کا بچانا ضروری ہے - لیکن جہاں تک آبرو کا تعلق ہے اس میں مختلف انسانوں میں ہی نہیں بلکہ مختلف قوموں میں بھی فرق ہے - ہمارے ہاں اگر کسی کنواری لڑکی سے لغزش ہو جائے اور اسے حمل قرار پا جائے تو اسے اس قدر معیوب سمجھا جاتا ہے کہ بسا اوقات وہ لڑکی شرم کے مارے اپنی جان ہلاک کر لیتی ہے - لیکن انگلستان میں اسے قطعاً بُرا نہیں سمجھا جاتا - حتیٰ کہ اگر اس بچے کا باپ اس لڑکی سے شادی کر لے تو اس بچے کو قانوناً جائز بیٹا تسلیم کر لیا جاتا ہے - آبرو کے متعلق یہ اختلاف بڑا غور طلب ہے - انگلستان والے کہتے ہیں کہ چونکہ یہ چیز ہماری سوسائٹی میں بُری نہیں سمجھی جاتی اس لئے یہ بُری نہیں ہے - تمہاری سوسائٹی اسے بُرا سمجھتی ہے اس لئے تم اسے بُرا کہتے ہو - سوال یہ ہے کہ کیا کسی چیز کے اچھے یا بُرے ہونے کا معیار یہی ہے کہ جس چیز کو سوسائٹی اچھا قرار دے دے وہ اچھی ہو جاتی ہے اور جسے وہ بُرا کہہ دے وہ بُری ہوتی ہے ؟ یہ معیار تو کوئی معیار نہیں - معیار ایسا ہونا چاہیئے جس کے مطابق اچھی بات ہمیشہ اچھی سمجھی جائے اور بُری بات بُری ہی رہے خواہ ساری دنیا اسے اچھا کیوں نہ سمجھنے لگ جائے -

ہمارے لئے یہ معیار ہے اللہ کی کتاب ـــــ قرآن مجید ـــــ وہی یہ بتاتا ہے کہ کون سی چیز زیادہ قیمتی ہے اور کون سی کم قیمت کی - کون سی چیز ایسی ہے جسے اس سے زیادہ قیمتی چیز کی خاطر قربان کر دینا چاہیئے اور کون سی ایسی جسے کسی حالت میں بھی قربان نہیں کیا جا سکتا - ایسی چیزیں جنہیں کسی دوسری چیز کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا مستقل اقدار کہلاتی ہیں - اقدار، قدر کی جمع ہے اور قدر کے معنی ہیں قیمت - لہٰذا، قرآن مجید ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مستقل اقدار کیا ہیں - انہی کو نہ بدلنے والے اصول یا قوانینِ خداوندی کہا جاتا ہے -

جو شخص قرآن مجید کی بتائی ہوئی اقدار کو صحیح مانتا ہے اُسے مسلمان کہتے ہیں اور جو مملکت ان اقدار کی حفاظت کرتی اور ان کے مطابق معاملات کے فیصلے کرتی ہے اسے اسلامی مملکت کہتے ہیں -

آئندہ خطبات میں یہ بتایا جائے گا کہ یہ مستقل اقدار کیا ہیں - والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دوسرا خطبہ

قانونِ مکافاتِ عمل

قال اللہ تعالےٰ : فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ـ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

(الزلزال - آیات ۷-۸) -

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ جو شخص ایک ذرّہ برابر بھی بھلائی کرتا ہے اسے اس کی جزا ملتی ہے اور جو شخص ایک ذرّہ برابر بُرائی کرتا ہے اسے اس کی سزا ملتی ہے -

پچھلے خطبہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ دین ہمیں مستقل اقدار دیتا ہے۔ جو کام ان مستقل اقدار کے مطابق کیا جائے اسے نیکی کہتے ہیں۔ جو ان کے خلاف کیا جائے وہ برائی کہلاتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ یہ بتایا جائے کہ وہ مستقل اقدار کیا ہیں جنہیں اللہ تعالٰی نے حضور نبی اکرمؐ پر نازل کردہ وحی کے ذریعے قرآن مجید میں عطا کیا ہے، ایک اور بات کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں ٹریفک کا قانون یہ ہے کہ سڑک کے بائیں ہاتھ چلو۔ آپ کسی ایسے چوراہے پر کھڑے ہو جائیں جہاں عام طور پر تانگے، سائیکل وغیرہ آتے جاتے ہوں۔ آپ دیکھیں گے کہ تانگے والا دور سے دیکھے گا کہ چوراہے پر ٹریفک کا سپاہی ہے یا نہیں۔ اگر سپاہی کھڑا ہے تو وہ بائیں ہاتھ چل کر موڑ مڑے گا۔ لیکن اگر سپاہی نہیں ہے تو وہ جھٹ سے دائیں ہاتھ کی طرف ہولے گا۔ اگر سپاہی کہیں چھپا کھڑا ہے تو وہ تانگے والے کو پکڑے گا اور اسے اس قانون شکنی کی سزا ملے گی۔ اگر سپاہی وہاں فی الواقعہ موجود نہیں تو تانگے والا دندناتا ہوا چلا جائے گا۔ کوئی اسے پوچھے گا بھی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تانگے والے نے غلط کام تو کیا ہے لیکن اسے اس کی سزا نہیں ملی۔ یا اگر وہاں سپاہی موجود ہے اور وہ دیانت دار نہیں تو تانگے والا اسے دو چار آنے کے پیسے دے کر چھوٹ جائے گا۔ اس صورت میں بھی وہ اپنے جرم کی سزا سے بچ جائے گا۔ یا اگر سپاہی نے اس کا چالان کر دیا ہے لیکن (بدقسمتی سے) مجسٹریٹ دیانت دار نہیں تو بھی مجرم سزا سے بچ جاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کتنے لوگ ہیں جو قانون شکنی کے باوجود اس طرح سزا سے بچ جاتے ہیں اور دل میں خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں کہ ہم سب کچھ کرتے ہیں لیکن ہمارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔

قانون شکنی اور اس کی سزا کی ایک صورت تو یہ ہے۔ اب دوسری صورت دیکھئے۔ ہمارے محلے میں ایک شخص بیمار تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے مرض کی تشخیص کی۔ دوائی دی اور ساتھ ہی تاکید سے کہہ دیا کہ تم نے میٹھا نہیں کھانا۔ اگر ایسا کرو گے تو مرض بڑھ جائے گا۔ ڈاکٹر بڑا قابل تھا۔ علاج بھی نہایت عمدگی سے ہو رہا تھا۔ لیکن مریض کو فائدہ ہونے کے بجائے، دن بدن اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اس سے پوچھتے کہ تم میٹھا تو نہیں کھاتے۔ وہ پورے یقین کے ساتھ کہہ دیتا کہ بالکل نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں بات نہیں آتی تھی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ اسے آرام کیوں نہیں آتا۔ ایک دن جبکہ کمرے میں کوئی نہیں تھا، مریض کی بیوی نے دیکھا کہ وہ چپکے سے میٹھا کھا رہا ہے۔ وہ جھٹ سے اوپر جا پہنچی اور اس سے کہا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ اس وقت کون سے ڈاکٹر صاحب دیکھ رہے تھے۔ میں تو ہر روز ایسا ہی کرتا ہوں۔

آپ نے غور کیا کہ تانگے والے نے بھی حکم کی خلاف ورزی کی اور اس بیمار نے بھی حکم کی خلاف ورزی کی۔ تانگے والے کو اگر کسی نے نہیں دیکھا تو اس کا کچھ نقصان نہیں ہوا۔ وہ حکم کی خلاف ورزی کی سزا سے بچ گیا۔ لیکن یہ مریض، ڈاکٹر کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا سے نہیں بچ سکا۔ یہ اس کے حکم کے خلاف میٹھا کھاتا رہا اور اس کی سزا یہ تھی کہ اس کی بیماری برابر بڑھتی رہی۔ اس سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑا کہ اسے کوئی شخص دیکھتا تھا یا نہیں دیکھتا تھا۔ ڈاکٹر وہاں موجود تھا یا نہیں تھا۔ فرض کیجئے کہ اسے کوئی شخص میٹھا کھاتے دیکھ لیتا اور وہ اسے دس روپے دے کر اس کی منت کرتا کہ یہ بات ڈاکٹر کو نہ بتانا۔ اس صورت میں بھی وہ اپنے جرم کی سزا سے بچ

نہیں سکتا تھا۔ میٹھا اپنا مُضر اثر برابر کیے جاتا۔ اس کی تکلیف بڑھتی چلی جاتی۔ اس سے ظاہر ہے کسی کو اس قسم کے جرم کی سزا سے نہ رشوت بچا سکتی ہے نہ سفارش۔ جو اس قسم کا جرم کرتا ہے اُسے اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اُسے اس سزا سے بچا نہیں سکتی۔

ایک اور شخص کا واقعہ سنیئے۔ اس کی صحت بڑی اچھی تھی اور وہ فخر سے لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ دیکھئے! سال بھر ہوا، ڈاکٹروں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اگر تم نے میٹھا کھانا کم نہ کیا تو مر جاؤ گے۔ میں برابر میٹھا کھا رہا ہوں۔ لیکن میرا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ ایک دن معلوم ہوا کہ وہ اچھا بھلا سویا۔ آدھی رات کے وقت اُسے دورہ سا پڑا۔ صبح ڈاکٹر کے ہاں لے گئے تو اس نے کہا کہ اس کے بچنے کی بہت کم اُمید ہے۔ یہ مسلسل میٹھا کھاتا رہا ہے۔ اس نے اس کی حالت سخت خراب کر دی ہے۔ آپ سمجھے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ مطلب یہ کہ اس شخص پر میٹھا اپنا اثر برابر کر رہا تھا۔ لیکن اسے اس کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ مُضر اثر بڑھتا چلا گیا۔ تاآنکہ ایک دن اس کی حالت اس قدر خراب ہو گئی کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ یعنی اُسے ڈاکٹر کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا تو برابر مل رہی تھی لیکن وہ اسے محسوس نہیں کرتا تھا تاآنکہ ایک دن مرض نے اسے سختی سے پکڑ لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض جرائم ایسے ہیں کہ ان کی سزا کا اثر بہت دیر میں جا کر نمودار ہوتا ہے۔ مجرم سمجھتے ہیں کہ ہمارا کچھ نہیں بگڑ رہا لیکن یہ ان کی بھول ہوتی ہے۔ اندر ہی اندر ان کا سب کچھ بگڑ رہا ہوتا ہے۔

اب ایک اور مثال سنیئے۔ ایک شخص محنت مزدوری کر کے کچھ کماتا ہے اور اپنی حلال کی کمائی سے گھی خرید کر لاتا ہے۔ گھی کھانے سے اس کی طاقت بڑھتی ہے۔ دوسرا شخص کسی کی جیب کاٹتا ہے اور پولیس کی گرفت سے بچ جاتا ہے۔ وہ جو روپیہ اس طرح حاصل کرتا ہے اس کا گھی خرید کر کھاتا ہے۔ گھی کھانے سے اس کی بھی طاقت ویسے ہی بڑھتی ہے جیسے پہلے شخص کی۔ یعنی جہاں تک انسان کے جسم کی صحت اور طاقت کا تعلق ہے گھی یکساں اثر کرتا ہے خواہ وہ حلال کی کمائی سے خریدا جائے یا حرام کی کمائی سے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص (جس نے چوری کے روپے سے گھی خریدا تھا) اپنے جرم کی سزا سے بالکل بچ گیا۔ یہ پولیس کی گرفت سے بچ نکلا اس لئے اسے عدالت سے سزا نہ ملی۔ اور خالص گھی کھاتا رہا اس لئے (میٹھا کھانے والے مریض کی طرح) اس کی صحت پر بھی بُرا اثر نہ پڑا۔ اس سے لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اگر انسان ایسا انتظام کر لے کہ وہ پولیس کی گرفت میں نہ آ سکے۔ یا اسے عدالت سزا نہ دے۔ تو پھر اس کے جرم کی سزا کہیں سے نہیں ملتی۔

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ چوری کے پیسوں کا گھی کھانے سے انسان کے جسم پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔ لیکن انسان کے جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے اس کی ذات کہتے ہیں۔ حلال کی کمائی سے انسان کی ذات میں طاقت آتی ہے۔ حرام کی کمائی سے جو کچھ کھایا جائے اس سے اس کی ذات بیمار ہو جاتی ہے۔ اس چیز سے انسان کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ وہ پولیس کی گرفت سے بچ جائے۔ وہ عدالت کو رشوت دے کر یا سفارش پہنچا کر یا کسی اور طریق سے اپنا اثر زائل کر بھی ہو جائے۔ لیکن اسے اس کے جرم کی سزا مل کر رہتی ہے۔ یہ سزا اس کے جسم کو نہیں بلکہ اس کی ذات کو ملتی ہے۔ اس سے اُسے کوئی نہیں بچا سکتا۔

سوال یہ ہے کہ یہ سزا کون دیتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے ایسا قانون مقرر کر رکھا ہے کہ جو لوگ

مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کریں انہیں اس کا عمدہ اور خوشگوار بدلہ ملے اور جو لوگ ان اقدار کی خلاف ورزی کریں انہیں اس کی سزا ملے۔ خدا کا یہ قانون اس قدر محکم اور مضبوط ہے کہ اس کی زد سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ (۸۵/۱۲) "یہ حقیقت ہے کہ تیرے رب کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے" اس قانون کو جس کے مطابق انسان کے ہر ایک کام کی جزا یا سزا مل کر رہتی ہے، قانون مکافات عمل کہتے ہیں۔ یعنی انسانی اعمال کے بدلہ لینے کا قانون۔ آپ پولیس والے کی نگاہ سے بچ سکتے ہیں لیکن خدا کے اس قانون کی نگاہ سے نہیں بچ سکتے۔ وہ خدا جس کی کیفیت یہ ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (سورۃ المؤمن۔ آیت ۱۹) "جو نگاہوں کی خیانت اور دل میں چھپائے ہوئے ارادوں تک سے واقف ہے" یعنی اس کا قانون مکافات صرف اسی وقت گرفت نہیں کرتا جب کوئی شخص جرم کا مرتکب ہو جائے۔ وہ اس وقت گرفت کرتا ہے جب جرم کا خیال اس کے دل میں پیدا ہو۔ اس کا ارشاد ہے کہ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (سورۃ قٓ۔ آیت ۱۶) "انسان کا دل جو وسوسے اس کے اندر پیدا کرتا ہے ہم انہیں بھی جانتے ہیں۔ (جانیں کیوں نہ؟) ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں" ہم نے اپنے قانون مکافات عمل کی میزان کھڑی کر رکھی ہے جس میں ہر شخص کے اعمال (بلکہ اس کے خیالات اور ارادے) تلتے رہتے ہیں۔ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ۔ "سو جو شخص ذرہ بھر بھی بھلائی کرتا ہے وہ بھی اس کے سامنے آجاتی ہے" وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (الزلزال۔ آیت ۷-۸)۔ "اور جو شخص ذرہ برابر بھی برائی کرتا ہے وہ بھی اس کے سامنے آجاتی ہے۔ ان جرائم کی سزا سے کوئی شخص کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتا۔ لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا۔ اس بارے میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکتا۔ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ" نہ ہی اس سے کوئی سفارش قبول کی جاسکتی ہے۔ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ۔ نہ ہی کوئی شخص کچھ معاوضہ دے کر چھوٹ سکتا ہے۔ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (البقرہ آیت ۴۸) اور نہ ہی ایسے لوگوں کو کسی قسم کی مدد دی جاسکتی ہے۔ یہ ہے خدا کا قانون مکافات۔

مسلمان وہ ہے جو خدا کے اس قانون مکافات عمل پر پورا پورا یقین رکھے۔ اسی کو ایمان کہتے ہیں۔ یاد رکھیئے جو شخص قانون شکنی کرتے وقت یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کون دیکھتا ہے۔ یا جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں رشوت دے کر۔ سفارش پہنچا کر یا اپنا اثر ڈال کر جرم کی سزا سے بچ جاؤں گا وہ خدا کے قانون مکافات پر ایمان نہیں رکھتا۔

چونکہ اسلامی مملکت قوانین خداوندی کو دنیا میں نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اس لئے اس مملکت میں کوئی مجرم اپنے جرم کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ اس میں نہ رشوت کام دے سکتی ہے نہ سفارش۔ نہ کسی کا اثر و رسوخ کچھ کر سکتا نہ اس کا عہدہ یا مرتبہ اس کے کسی کام آسکتا ہے۔ اس میں جو شخص قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنے کئے کی سزا پاتا ہے۔ جو قانون کا احترام کرتا ہے وہ عزت اور امن کا مستحق ہوتا ہے۔ یہ غیر متبدل اصول ہے۔ یہ مستقل قدر ہے جسے کوئی نہیں بدل سکتا۔ والسلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

تیسرا خطبہ

دیر ہے ۔ اندھیر نہیں

قال اللہ تعالیٰ ، اِنَّہٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ (سورۃ انعام ۔ آیت ۲۱)

ارشادِ خداوندی ہے کہ اس بات پر اچھی طرح سے یقین رکھو کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی ۔ ظلم کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ۔

گزشتہ خطبہ میں ہم نے بتایا تھا کہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق انسان کا ہر کام نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے ۔ جو بھلائی کرتا ہے اسے اس کی جزاء ملتی ہے ۔ جو برائی کرتا ہے وہ اس کی سزا پاتا ہے ۔ خدا کے اس قانون میں کبھی کوتاہی نہیں ہوتی ۔ اس میں کوئی شخص کمی بیشی نہیں کر سکتا ۔ وہ خطبہ سننے کے بعد ایک شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ جو کچھ آپ نے کہا تھا اس پر ہمارا ایمان تو ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ۔ لیکن معاف فرمایئے ۔ ہم جو کچھ دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ اس کے بالکل برعکس ہے ۔ خدا کا فرمان تو یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھتی ۔ ظلم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ بددیانتی اور بے ایمانی ہمیشہ نقصان دیتی ہے جو دوسرے کا برا کرتا ہے اس کا ہمیشہ برا ہوتا ہے ۔ جو مظلوم کو ستاتا ہے وہ کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا ۔ جو غریبوں کو لوٹتا ہے وہ تباہ اور برباد ہو جاتا ہے ۔ جو کمزوروں پر ہاتھ اٹھاتا ہے اس کے ہاتھ ٹوٹ جاتے ہیں ۔ جو کسی کے لئے کنواں کھودتا ہے وہ خود کنوئیں میں گرتا ہے ۔ لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ دنیا میں ہوتا اس کے بالکل الٹ ہے ۔ دور کیوں جائیں ۔ ہم نے خود پاکستان میں جو کچھ ہوتے دیکھا ہے وہ اس کی زندہ شہادت ہے کہ ظالم کی کھیتی پروان چڑھتی ہے اور مظلوم ہمیشہ تباہ اور برباد ہوتا ہے ۔ دولت مند لوگ اپنی دولت کے نشے میں بدمست سب کچھ کرتے ہیں اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا ۔ وہ غریبوں پر ہر قسم کا ظلم ڈھاتے ہیں ۔ وہ ان کی محنت کی کمائی ان سے زبردستی چھین لیتے ہیں ۔ ان کے ہاتھوں نہ ان غریبوں کی جان محفوظ ہوتی ہے نہ مال ۔ نہ عزت باقی رہتی ہے نہ آبرو ۔ وہ در بدر دھکے کھاتے ہیں ۔ ایک ایک کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں ۔ وہ ہر صاحب اقتدار سے عدل و انصاف کی بھیک مانگتے ہیں ۔ لیکن ان کی جھولی میں کہیں سے ایک ٹکڑا نہیں پڑتا ۔ ان ظالموں ، خونخواروں کے کتے ریشمی گدوں پر سوتے ہیں اور بیچاری بیواؤں کے یتیم بچوں کو سردی سے بچنے کے لئے لحاف تک نصیب نہیں ہوتا ۔ معاف فرمایئے ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کا قانونِ مکافات کہاں چلا جاتا ہے ؟ ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ دیانتداری سے کاروبار میں برکت ہوتی ہے ۔ لیکن ہم نے دیکھا یہ ہے کہ کاروبار چلتا ہی اس کا ہے جو بددیانتی کرے ۔ ایمانداری سے کام کرنے والا چار دن میں اپنی پونجی بھی ضائع کر کے بیٹھ جاتا ہے لیکن بددیانتی کرنے والے سونے کے محلات بناتے چلے جاتے ہیں ۔ معلوم نہیں خدا کا قانونِ مکافات کون سی دنیا میں چلتا ہے ۔ ہماری دنیا میں تو یہی قانون

ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ ہمارے ہاں تو مسلسل یہی قانون چلتا آ رہا ہے۔

جس شخص نے ہم سے یہ باتیں کیں وہ بڑا دکھی تھا۔ ہم نے بڑے اطمینان اور سکون سے ان باتوں کو سُنا۔ یہ باتیں تنہا اُس ایک شخص کے دل کی آواز نہیں تھی۔ ہزاروں۔ لاکھوں مظلوم انسان ہیں جن کے دل میں اسی قسم کے خیالات آتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ ان خیالات کو زبان تک لے آتے ہیں۔ باقی اپنے دل کے اندر رکھتے ہیں۔ یہ خیالات ایسے نہیں جنہیں یونہی سُن کر ٹال دیا جائے۔ ان پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے اور ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیئے کہ اگر خدا کا قانونِ مکافات برحق ہے (اور اس کے برحق ہونے میں کسے شُبہ ہو سکتا ہے؟) تو پھر دنیا میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟

بات بڑی اہم ہے اس لئے اسے بڑی توجہ سے سُننا چاہیئے۔ اسے ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اکتوبر۔ نومبر کا مہینہ ہے۔ زمینیں گیہوں کی بوائی کے لئے تیار ہیں۔ اُن دنوں کسانوں کے گھروں میں عام طور پر غلّے کی کمی ہوتی ہے لیکن انہوں نے بیج کے لئے غلہ سنبھال کر رکھا ہوتا ہے۔ دو کسان ہیں جن کے گھروں میں فاقوں تک کی نوبت آ رہی ہے۔ ان میں سے ایک کسان اپنے بیج کا غلہ لیتا ہے اور چکی پر جا کر آٹا پسوا لاتا ہے۔ اس کے گھر میں رات کو تازہ تازہ گیہوں کی روٹیاں پکنے لگ جاتی ہیں۔ وہ اور اس کے بیوی بچے پیٹ بھر کر روٹی کھاتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ان کی مصیبت کٹ گئی۔ دوسرا کسان غلّہ باہر لے جاتا ہے اور کھیت میں بیج ڈال دیتا ہے۔ اس کے گھر میں بدستور تنگی رہتی ہے۔ اسے اور اس کے بیوی بچوں کو گیہوں کی روٹی دیکھنی تک نصیب نہیں ہوتی۔ یہ ہر روز کھیت پر جاتا ہے اور دن بھر محنت کرتا ہے۔ لیکن شام کو پھر خالی ہاتھ واپس گھر آ جاتا ہے۔ دوسرا کسان اپنا بیل بیچ کر چند دن کے لئے پھر مزے اڑاتا ہے۔ پھر زمین رہن رکھ دیتا ہے اور بڑی خوش حالی سے دن گزارتا ہے۔ لیکن اس کا ہمسایہ سخت مصیبت کے دن کاٹتا ہے۔ ایک مہینہ۔ دو مہینے تین مہینے۔ چار مہینے۔ پانچ مہینے۔ چھ مہینے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح، برابر محنت کرتا ہے لیکن اسے کھیت میں سے ایک وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی۔ اس کے بچے اس سے برابر پوچھتے رہتے ہیں کہ بابا! ہمارا ہمسایہ کوئی کام نہیں کرتا اور وہ اور اس کے بچے عیش اڑاتے ہیں، ہم دن رات محنت کرتے رہتے ہیں اور ہمیں ٹکڑہ تک نصیب نہیں ہوتا۔ ہم نے سُنا تھا کہ محنت اپنا پھل لاتی ہے لیکن ہماری محنت تو کوئی پھل نہیں لاتی۔ ہم تو محنت کرتے ہیں اور خالی ہاتھ گھر آ جاتے ہیں وہ ان سے کہتا ہے کہ بیٹا! محنت اپنا پھل لاتی ہے۔ خدا کا قانون بالکل سچا ہے۔ لیکن بیج بونے اور فصل پکنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ ایک مدت ہوتی ہے۔ کوئی شخص اس وقفے کو کم نہیں کر سکتا۔ جو شخص ہمت اور استقلال سے اس دوران میں محنت کئے جاتا ہے اور حوصلہ نہیں ہارتا، اس کی محنت اپنے وقت پر پھل لا کر رہتی ہے۔ وہ انہیں یہ نصیحتیں کرتا رہتا ہے کہ اتنے میں کٹائی کے دن آ جاتے ہیں اور اس کسان کا سارا گھر غلّے سے بھر جاتا ہے۔ اس کی محنت بالآخر پھل لاتی ہے: كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ (البقرہ۔ آیت ۲۶۲) "اس دانے کی طرح جو سات بالیں اگائے اور ہر ایک بال میں سو سو دانے ہوں"۔ اس طرح اس دیانت دار۔ محنت کش کسان کو ایک ایک دانے کے بدلے سات سات سو دانے ملتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرا کسان جس نے خدا کے قانون کو چھوڑ کر بیج کے دانے بیچ ڈالے تھے، اس کا نہ گھر رہا نہ بار۔ نہ ڈھور رہے نہ ڈنگر۔

نہ کھیتی رہی نہ زمین۔ وہ مفلس اور قلاش ہو کر دربدر کی بھیک مانگنے لگ گیا۔

یہ کیفیت ہے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی۔ وہ بالکل برحق ہے۔ لیکن بیج کے بونے اور کھیتی کے پکنے میں وقت ضرور لگتا ہے۔ جو اس سے تنگ نہیں آتا اور ہمت اور استقلال سے تمام مشقتوں کو برداشت کرتا ہے اس کی کھیتی پروان چڑھ جاتی ہے۔ جو مایوس ہو کر زمین میں بیج نہیں ڈالتا۔ یا جلد بازی میں سبز گیہوں بیلوں کو چرا لیتا ہے' وہ آخرالامر تباہ اور برباد ہو جاتا ہے۔ یہی مثال ظالم کی ہے۔ اس کی کھیتی کبھی نہیں پنپتی۔ لیکن اس کے ظلم کرنے اور ظلم کا نتیجہ برآمد ہونے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اس مہلت کے وقفے میں سمجھ جائے۔ اُسے ہوش آجائے اور وہ ظلم کو چھوڑ کر مظلوموں کی امداد کرنے لگ جائے۔ وہ غریبوں سے ہمدردی کرے۔ وہ عدل اور انصاف کے راستے ہموار کر دے۔ وہ دیانت اور امانت پر کاربند ہو جائے۔ تو اس کے یہ نیک کام اس کی سابقہ برائیوں کے داغوں کو دھو ڈالتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے اور اپنے ظلم اور سرکشی میں بڑھتا ہی چلا جائے تو پھر خدا کا قانون ایسے لوگوں سے پکار کر کہتا ہے کہ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ (المعارج آیت ۴۱)۔ ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئیں جو ان سے بہتر ہوں۔ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جو ہمیں ایسا کرنے سے روک دے۔ جو ہمیں عاجز کر دے۔ جو ہم سے آگے بڑھ جائے۔ چنانچہ وہ لوگ جو ان سے بہتر ہوتے ہیں آتے ہیں اور ان کے ظلم اور سرکشی کے راستوں کو روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی کلائیاں توڑ دیتے ہیں۔ یوں خدا کا قانونِ مکافاتِ عذاب بن کر ان کے سر پر مسلط ہو جاتا ہے۔ سورہ انبیاء میں قرآن کریم نے ان کی اس کیفیت کو بڑے دلکش اور عبرت انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۔ "کتنی ہی بستیاں ہم نے تباہ اور برباد کر دیں جن کے رہنے والے ظالم تھے۔ اور ان کے بعد ہم نے (ان کی جگہ) دوسرے لوگوں کو اٹھا کھڑا کیا"۔ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ۔ ان ظالموں کی حالت یہ تھی، (وہ اپنی سرکشیوں میں مست تھے اور انہیں اس کا کچھ علم نہیں تھا کہ ان کے اعمال کے نتائج برآمد ہونے کا وقت آپہنچا ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں اپنے سامنے دیکھا تو اس سے بھاگنے لگے۔ ہمارے قانونِ مکافات نے پکارا کہ لَا تَرْكُضُوْا۔ اب مت بھاگو۔ (تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے)۔ وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ۔ وہ بڑے بڑے محلات (جو تم نے غریبوں پر ظلم کر کے تعمیر کئے تھے)۔ وہ تمہاری آسائش گاہیں (جن میں تم نے عیش و عشرت کے سامان جمع کر رکھے تھے) تم ان کی طرف واپس چلو۔ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ (الانبیاء، آیات ۱۳-۱۱) تاکہ تم سے پوچھا جائے (کہ تم نے یہ دولت کہاں سے لی تھی)۔ انہیں اس طرح پکڑا جائے گا۔ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۔ اور وہ اس کا اقرار کریں گے کہ ہم بے واقعی لوگوں پر ظلم اور زیادتی سے یہ سب کچھ اکٹھا کیا تھا۔ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (ایضاً آیات ۱۵-۱۴)۔ وہ ایسا پکارتے رہیں گے۔ (لیکن اس وقت ان کا یہ اعتراف اور اقرار انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا)۔ ہمارا قانونِ مکافات انہیں ایسا بنا دے گا جیسے کٹے ہوئے کھیت۔ یا بجھے ہوئے شعلے (کہ جن کی صرف راکھ باقی رہ جائے)۔ یوں خدا کا قانونِ مکافات ظالموں اور سرکشوں کو آخرالامر تباہ اور برباد

کر دیتا ہے۔

لیکن جن لوگوں کے ہاتھوں وہ انہیں تباہ اور برباد کراتا ہے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتا ہے کہ تم نے یہ نہ سمجھ لینا کہ تم جو بھی میں آئے کرو۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (سورہ یونس۔ آیت ۱۴)۔ پھر ہم نے ملک میں تمہیں ان کا جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔ انہوں نے ظلم کیا تو وہ تباہ اور برباد ہو گئے۔ تم ظلم کرو گے تو تم بھی تباہ اور برباد ہو جاؤ گے۔ خدا کا قانونِ مکافات نہ کسی پر ظلم کرتا ہے۔ نہ کسی کی رعایت کرتا ہے۔

مسلمان وہ ہے جو اس حقیقت پر یقین رکھے کہ عمل اور اس کے نتیجے میں وقفہ ضرور ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ عملِ بد اپنا نتیجہ مرتب نہ کرے۔ ظلم کی کھیتی چھپ کر رہتی ہے خواہ اس میں کتنی دیر کیوں نہ لگے۔ والسلام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ؕ

چوتھا خطبہ

افراد اور اُمّت

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران۔ آیت ۱۰۹)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم بہترین قوم ہو جسے تمام نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے

سابقہ خطبہ میں یہ حقیقت آپ کے سامنے آچکی تھی کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق ہر کام ـــــ خواہ وہ دل میں گزرنے والا ارادہ ہی کیوں نہ ہو ـــــ اپنا نتیجہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس میں وقت تو ضرور لگتا ہے جس طرح ایک بیج کو تناور پھل بننے کے لئے وقت لگتا ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بیج بویا جائے اور اس سے درخت بن کر پھل پیدا نہ ہو۔ یا بیج تو ہو ببول کا لیکن اُس پیڑ میں آم لگ جائیں۔

لیکن یہ دیکھنے کی بات ہے کہ بیج، درخت کس طرح بنتا ہے ـــــ بیج کو مٹی میں ملایا جاتا ہے۔ پھر اس میں پانی دیا جاتا ہے۔ اوپر سے سورج کی گرمی پہنچتی ہے۔ اس سے اُس بیج میں سے کونپل نکلتی ہے۔ وہ ہوا سے غذا حاصل کرتی ہے اور آگے بڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا، بیج کے درخت بننے کے لئے اس کے ساتھ مٹی۔ پانی۔ حرارت روشنی۔ ہوا کا ہونا ضروری ہے۔

لیکن اگر آپ ایسا کریں کہ اعلیٰ قسم کا بیج لیں اور اُسے برآمدے کے ایک کونے میں رکھ دیں۔ اس کے پاس ہی ایک طرف صاف ستھری مٹی کا ڈھیر لگا دیں۔ ایک طرف پانی کی بالٹی بھر کر رکھ دیں۔ سورج کی دھوپ سے روشنی اور حرارت اس بیج کو خود بخود ملتی جائے گی۔ ہوا بھی برآمدے میں موجود ہے۔ اس طرح وہ تمام چیزیں جمع ہو جائیں گی جن سے درخت بنتا ہے۔ لیکن آپ سوچئے کہ اگر یہ چیزیں سو برس تک بھی اس طرح پڑی رہیں تو ان سے درخت تو ایک طرف، ایک پتی بھی بن سکے گی؟ کبھی نہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ جب تک یہ تمام چیزیں

ایک دوسرے کے ساتھ نہ ملیں، بیج میں سے کونپل کبھی نہیں پھوٹ سکتی۔ بیج سے درخت بننے اور درخت میں پھل آنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ سب چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ اور تعاون بھی اس قسم کا کہ یہ سب اپنی اپنی الگ ہستی کو ایک دوسرے کے اندر جذب کر کے ایک نئی شکل اختیار کر لیں۔ آم، کہ جس کی رنگت خوشبو اور ذائقہ اس قدر دلفریب اور روح افزا ہوتا ہے، مٹی۔ پانی۔ حرارت۔ روشنی اور ہوا ہی کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ وہ انہی اجزاء سے بنتا ہے۔ لیکن آپ دیکھئے کہ نہ تو اس کے اندر کہیں یہ چیزیں اپنی اپنی شکل میں الگ الگ موجود ہوتی ہیں اور نہ ہی ان میں سے کسی شے میں آم کی رنگت۔ خوشبو اور شیرینی ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فطرت کا قانون یہ ہے کہ جب تک مختلف چیزیں باہمی تعاون نہ کریں اور ایک دوسرے کے اندر جذب نہ ہو جائیں۔ کوئی نئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔ اور جب یہ ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جائیں تو اس طرح جو نئی چیز بنتی ہے وہ ان تمام چیزوں سے نہایت ارفع اور اعلیٰ ہوتی ہے جن سے مل کر یہ نئی چیز بنتی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اس مٹی اور پانی کی قیمت اور حیثیت کیا تھی جن کے مل جانے سے آم بنا ہے۔ لیکن آم بن کر ان کی قیمت اور حیثیت کیا سے کیا ہو گئی۔

جس طرح پانی، مٹی، ہوا۔ حرارت کے الگ الگ رہنے سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اسی طرح اگر کسی جگہ کے انسان بھی الگ الگ رہیں تو ان سے کوئی فائدہ بخش کام سرانجام نہیں پاتا۔ لیکن جب یہی افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں تو یہ دنیا میں ایسے ایسے کام کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جب افراد آپس میں مل جائیں تو ان سے قوم بن جاتی ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اُمّت کا لفظ آیا ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ جب بیج۔ مٹی۔ پانی وغیرہ الگ الگ رہیں، خواہ وہ ایک ہی برتن کے اندر کیوں نہ ہوں، ان سے پودا نہیں بنتا۔ پودا بننے کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ چیزیں ایک دوسرے سے تعاون کریں بلکہ ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جائیں۔ عربی زبان میں اس طرح گھل مل جانے کو اُلفت کہتے ہیں۔ اس طرح، اگر کسی ملک کے افراد ایک دوسرے سے الگ الگ رہیں اور ہر ایک اپنے اپنے فائدے کے پیچھے لگا رہے، تو انہیں قوم یا اُمّت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ اُس وقت اُمّت بنتے ہیں جب یہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور گھل مل کر رہیں۔ یعنی ان میں اُلفت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مسلمانوں کے متعلق ہے کہ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا۔ "تم اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ (ایک وقت وہ تھا) جب تم الگ الگ تھے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اس نے تمہارے دلوں میں اُلفت ڈال دی اور تم ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگے۔ اس طرح تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔ وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا۔ تم تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (آلِ عمران۔ آیت ۱۰۳) اس طرح اللہ اپنے قوانین کو تمہارے فائدے کے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ زندگی اور کامیابی کا سیدھا راستہ تمہارے سامنے آ جائے۔ دوسری جگہ ہے: وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا .... (البقرہ۔ آیت ۱۴۳)۔ "اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین امّت (قوم) بنا دیا۔" اس سے

آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن مجید کی رُو سے افراد اس وقت قوم بنتے ہیں جب ان کے دل ایک دوسرے میں گھل مل جائیں۔ جب ان کے مفاد ایک دوسرے کے مفاد میں جذب ہو جائیں۔ اگر ایسی صورت پیدا نہ ہو تو محض ایک مقام پر اکٹھے رہنے سے اُمّت نہیں بن سکتی۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے لئے کہا ہے کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى ..... (سورہ الحشر۔ آیت ۱۴) تو سمجھتا ہے کہ وہ اکٹھے ہیں حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ ہیں"۔ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ (ایضاً)۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی آپس میں سخت لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ (ایضاً)۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن مجید نے افراد کے قوم بننے کے لئے کیا کیا شرائط عائد کی ہیں۔ یہ کہ ان کے دل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ ان کے مفاد ایک دوسرے کے مفاد میں جذب ہوں۔ ان کا آپس میں کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ اور وہ جذبات سے مغلوب ہو کر یونہی آپے سے باہر نہ ہو جایا کریں بلکہ ہر معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کیا کریں۔ اس طرح جب مختلف افراد ایک قوم بن جاتے ہیں تو تمام افراد کی عزت اور پوزیشن ایک جیسی ہو جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پھولوں کے پودوں میں کھاد ڈالی جاتی ہے۔ کھاد ایسی چیز ہے جس سے ہر شخص نفرت کرتا ہے۔ اس سے پرے پرے رہنا چاہتا ہے۔ لیکن وہی کھاد جب اپنے آپ کو مٹی اور پانی میں جذب کر دیتی ہے تو پھول بن جاتی ہے جسے ہر شخص سینے سے لگائے اور سر پر چڑھائے رکھتا ہے۔ کھاد کو اس قدر حسین۔ خوشبودار۔ صاحبِ عزت کس چیز نے بنا دیا؟ اس چیز نے کہ اس نے الگ رہنے کے بجائے اپنے آپ کو دوسرے اجزاء کے اندر جذب کر دیا۔ اسی طرح اُمّت کے اندر جذب ہو جانے سے ہر فرد کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مٹھائی چار روپے سیر بکتی ہے۔ مٹھائی میں کیا ہوتا ہے؟ میدہ جس کی قیمت بارہ آنے سیر ہے۔ شکر (یعنی کھانڈ) جس کا نرخ ایک روپیہ فی سیر ہے۔ اگر میدہ الگ رہے اور شکر الگ رہے تو ان کی قیمت بارہ آنے اور ایک روپیہ فی سیر سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہ ہو۔ لیکن جب انہوں نے اپنے آپ کو دیگر اجزاء کے ساتھ ملا دیا تو ان کی قیمت بھی چار روپے فی سیر ہو گئی[1]۔ اسی طرح جب افراد اپنے آپ کو اُمّت میں جذب کر دیتے ہیں تو سب افراد کی قیمت ایک جیسی ہو جاتی ہے۔ اس میں بڑے اور چھوٹے کا کوئی فرق نہیں رہتا۔ جو قیمت قوم کے سب سے بڑے فرد کی ہوتی ہے وہی قیمت قوم کے سب سے چھوٹے فرد کی ہوتی ہے ان میں تقسیمِ کار کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ کسی کے ذمے کوئی کام اور کسی کے ذمے کوئی۔ لیکن تقسیمِ کار سے افراد کی عزت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ عزت سب کی برابر ہوتی ہے۔ آپ گھڑی کو دیکھئے۔ اس میں مختلف پرزے ہوتے ہیں اور ہر ایک پرزے کے ذمے الگ الگ کام ہوتے ہیں۔ اس میں سونے کا ہیرے کا نگینہ بھی ہوتا ہے اور دو پیسے کا پیچ بھی۔ الگ الگ دیکھئے تو ہیرے کے مقابلے میں پیچ کی کوئی قیمت اور اہمیت نہیں ہوتی۔ لیکن گھڑی کے اندر پیچ کی اہمیت اس قدر ہوتی ہے کہ وہ اگر ذرا ڈھیلا ہو جائے اور اپنا کام چھوڑ دے تو ساری گھڑی بیکار

---

[1] کیسے بھلے دن تھے جب یہ خطبات لکھے گئے تھے (۱۹۷۹ء)

ہو جاتی ہے۔ اور بڑے سے بڑے بندے کی اہمیت بھی کچھ نہیں رہتی۔ جب مختلف افراد باہمی جذب سے اُمّت بنتے ہیں تو جو شخص چھوٹے سے چھوٹا کام کرے اس کی اہمیت بھی باقی پرزوں کے برابر ہوتی ہے۔ یہ ہندوؤں کا مذہب ہے جس میں برہمن کی عزت اور اہمیت الگ ہوتی ہے اور کھشتری کی الگ۔ ویش کی الگ ہوتی ہے اور شودر کی الگ۔ اسلام اس قسم کی کوئی تفریق نہیں کرتا۔ وہ تمام افراد کو ایک اُمّت قرار دیتا ہے۔ جتنی اس امت کی قدر و منزلت ہوتی ہے اتنی ہر فرد کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ ان افراد کے دلی تعاون سے امّت کا نظام قائم رہتا ہے۔ اور جیسا کہ پچھلے خطبہ میں بتایا گیا تھا، خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل اِسی نظام کے ذریعے اپنے نتائج سامنے لاتا ہے۔ یہی نظام ہے جو ظالموں کی کلائیاں مروڑ کر عدل اور انصاف کی فضا قائم کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اگر ان ظالموں کے حوصلے دراز ہوتے چلے جاتے ہیں تو اس لئے کہ ہم ایک امّت۔ ایک قوم کی حیثیت سے نہیں رہتے تھے۔ افراد کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ یاد رکھیے۔ قرآن مجید نے ہمیں ایک اُمّت بنایا ہے۔ افراد کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں۔ مسلمان اس وقت مسلمان بنتا ہے جب وہ امّت کی مشینری کا پرزہ بن کر رہتا ہے۔ جونہی وہ اس مشینری سے الگ ہوا، اسلام کا قلادہ اس کی گردن سے اتر گیا۔

آئندہ خطبات میں یہ بتایا جائے گا کہ قرآن مجید کی رُو سے مختلف افراد ایک اُمّت کس طرح بنتے ہیں۔ اور اس اُمّت کا فریضۂ زندگی کیا ہے۔ والسلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

پانچواں خطبہ

افراد، قوم کس طرح بنتے ہیں

امابعد۔ قال اللّٰہ تعالٰی: یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَ صَابِرُوۡا وَ رَابِطُوۡا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (آل عمران ۔ آیت ۱۹۹)

ارشادِ خداوندی ہے کہ اے افرادِ جماعتِ مومنین۔ تم خود بھی ثابت قدم رہو۔ اور دوسروں کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرو۔ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہو۔ اور (اس طرح سب مل کر) قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ تقویٰ شعار بنو۔ تاکہ تم کامیاب زندگی بسر کر سکو۔

سابقہ خطبہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ اسلامی زندگی یہ ہے کہ تمام افراد باہمی مل کر امّت بن جائیں۔ اسلامی زندگی اُمّت یا قوم بن کر رہنے کی زندگی ہے۔ الگ الگ رہنے اور اپنے اپنے مفاد کے پیچھے دوڑنے کی زندگی مسلمان کی زندگی نہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مختلف افراد ایک قوم کس طرح بنتے ہیں۔ الگ الگ مسلمان ایک اُمّت کے دھاگے میں کس طرح پروئے جاتے ہیں۔ آج ہم اس اہم حقیقت کو آپ کے سامنے بیان کریں گے۔

آپ نے کبھی فٹ بال کا میچ دیکھا ہے، ضرور دیکھا ہوگا۔ اس میں ایک طرف گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ یہ سب کھلاڑی میدان کے آدھے حصے میں بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ کوئی پیچھے۔ کوئی آگے۔ کوئی درمیان میں۔ کوئی دائیں۔ کوئی بائیں۔ کوئی سب سے اخیر ایک جگہ اکیلا کھڑا دکھائی دے گا۔ وہ اس طرح بکھرے ہوئے ہوتے ہیں جیسے ایک کو دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اتنے میں سیٹی بجتی ہے اور بال میدان میں آجاتا ہے۔ یہ بکھرے ہوئے کھلاڑی بڑی تیزی سے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ میدان میں عجیب ہلچل مچ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا افراتفری کا عالم ہے۔ لیکن اس افراتفری اور ہلچل میں ایک چیز عجیب دکھائی دیتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے جس کے قریب بھی بال آجاتا ہے وہ اسے ایک خاص سمت کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ان میں سے ایک کھلاڑی بال کو مشرق کی طرف لے جائے اور دوسرے کی باری آئے تو وہ اسے مغرب کی طرف لے جائے۔ جس سمت کو یہ سب کھلاڑی بال کو لے جانا چاہتے ہیں اُسے انگریزی زبان میں گول کہتے ہیں۔ گول کے معنی ہیں نصب العین، منزلِ مقصود۔ وہ نقطہ جس پر سب کی نگاہ ہو۔ وہ چیز جسے سب مل کر حاصل کرنا چاہیں۔ کھلاڑی گیارہ ہوتے ہیں لیکن ان سب کے سامنے گول ایک ہی ہوتا ہے۔ جن کھلاڑیوں کے سامنے ایک مشترکہ گول ہو انہیں انگریزی زبان میں ٹیم کہتے ہیں۔

اسی طرح جب کسی جگہ کے رہنے والے انسانوں کے سامنے ایک مشترکہ نصب العین ہو تو انہیں قوم یا اُمّت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا افراد اس صورت میں قوم بن سکتے ہیں جب ان سب کے سامنے ایک گول۔ ایک نصب العین یا ایک منزلِ مقصود ہو۔ اگر کسی ملک کے باشندوں کے سامنے ایک نصب العین نہ ہو تو وہ قوم نہیں بن سکتے۔ یا مختلف لوگوں کے سامنے مختلف نصب العین ہوں تو بھی وہ ایک قوم نہیں بن سکتے۔

دنیا کے مختلف ملکوں کے رہنے والے اپنے سامنے مختلف نصب العین رکھتے ہیں اور اس طرح ایک ملک کے باشندے ایک قوم بن جاتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا نصب العین خود ان کے خدا نے مقرر کر دیا ہے۔ اس لئے ان سے کہا ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران۔ آیت ۱۰۲) تم سب مل کر۔ اکٹھے ہو کر۔ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رکھو یہی تم سب کا نصب العین ہے۔ اس نصب العین کی وحدت سے تم ایک اُمت بنتے ہو۔ اس لئے تم الگ الگ نصب العین سامنے رکھ کر) مختلف گروہ نہ بن جاؤ۔ یہ "اللہ کی رسّی" جس سے مسلمان ایک اُمت بنتے ہیں اس کی کتاب یعنی قرآن مجید ہے۔ یہی وہ گول ہے جس کی طرف ہر مسلمان کا رُخ ہونا چاہیئے۔ یہی وہ منزلِ مقصود ہے جس کی طرف ان سب کا قدم اٹھنا چاہیئے اسی وحدتِ نصب العین کا نام توحید ہے۔ کھیل کے میدان میں جن گیارہ کھلاڑیوں کا گول ایک ہوتا ہے انہیں ایک ٹیم کہا جاتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں دوسرے کھلاڑیوں کا گول ان سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ دوسری ٹیم کہلاتے ہیں۔ آپ نے غور کیا کہ ایک ہی میدان کے کھلاڑی دو گروہ کس طرح بن گئے؟ محض گول کے الگ الگ ہونے سے۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح میں قوم کے نصب العین یا گول کو آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان آئیڈیالوجی کی وحدت کی بنا پر اُمت بنتے ہیں۔ ان سب کی آئیڈیالوجی ایک ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے اسی کا نام توحید ہے۔ اگر ان کی آئیڈیالوجی مختلف ہو جائے تو اسے شرک کہیں گے۔ اس لئے اللہ تعالےٰ ان سے

کہا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (سورۃ روم۔ آیت ۳۲)۔ اے مسلمانو! دیکھنا تم کہیں (مومن ہونے کے بعد پھر) مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھے۔ پھر ان میں سے ہر ایک فرقے کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ اپنے طریقہ (کو حق سمجھ کر اس) میں مگن ہو گیا۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کس طرح نصب العین کی وحدت کو توحید اور نصب العین کے اختلاف کو شرک قرار دیا ہے۔ یہ اس لئے کہ مسلمان ایک امت بنتے ہی نصب العین کی وحدت سے ہیں۔ جب مختلف گروہوں کے سامنے نصب العین مختلف ہو گئے تو ایک دوسرے سے الگ الگ ہو گئے۔ یہ ایک امت نہ رہے۔ ان کی وحدت ٹوٹ گئی۔ ان میں توحید کی جگہ شرک آ گیا۔ مسلمانوں کا نصب العین قرآن کریم ہے۔ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اسی سے مسلمان ایک امت بنتے ہیں۔ یہی ہماری آئیڈیالوجی ہے۔ اس کی خاطر ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔

آپ کہیں گے کہ اس کے لئے پاکستان حاصل کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ قرآن کریم ہمارے پاس اس وقت بھی موجود تھا جب ہم متحدہ ہندوستان میں رہتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس وقت ہم قرآن کریم پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ قرآن کریم زندگی کا ضابطہ ہے۔ یہ قانون کی کتاب ہے۔ جیسا کہ پہلے خطبہ میں بتایا گیا تھا، اس میں خدا نے مستقل اقدار یا نہ بدلنے والے اصول دیئے ہیں تاکہ ہم ان کے مطابق زندگی بسر کریں۔ لیکن ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر نہیں ہو سکتی جب تک اپنی حکومت نہ ہو۔ ہم نے اسی مقصد کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا کہ ہم اپنی مملکت میں قرآن کریم کی مستقل اقدار کو قانون بنا کر نافذ کر سکیں اور اس طرح اپنی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھال سکیں۔ قرآن کریم نے مومن اور کافر میں فرق ہی یہ بتایا ہے کہ مومن وہ ہیں جو قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ کافر ہیں: وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔ (سورۃ المائدہ۔ آیت ۴۴) جو خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، سو وہی لوگ کافر ہیں۔

مومن کے معنی ہیں ماننے والا اور کافر کے معنی ہیں نہ ماننے والا۔ انکار کرنے والا۔ یعنی جو لوگ قرآن کریم کو بطور نصب العین یا آئیڈیالوجی کے مانتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق مملکت قائم کرتے ہیں، وہ مومن ہیں۔ جو لوگ قرآن کریم کو اپنی زندگی کا نصب العین یا آئیڈیالوجی نہیں مانتے اور اس کے مطابق مملکت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ

(۱) افراد اس وقت تک قوم نہیں بنتے جب تک ان کے سامنے ایک گول۔ ایک نصب العین یا ایک آئیڈیالوجی نہ ہو۔

(۲) جو لوگ قرآن کریم کو اپنی زندگی کا نصب العین مانتے ہیں، انہیں مسلمان کہتے ہیں اور وہ اس نصب العین کی وحدت سے ایک قوم یا امت بنتے ہیں۔

(۳) قرآن کریم کو زندگی کا نصب العین رکھنے سے مطلب یہ ہے کہ اس کے مطابق حکومت قائم کی جائے۔

(۴) ہم نے اسی مقصد کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اور اس کے لئے اسے حاصل کیا تھا۔

لیکن پاکستان حاصل کرنے کے بعد ہم بالکل بھول گئے کہ ہماری آئیڈیالوجی کیا ہے۔ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ یہ

ظاہر ہے کہ جب لوگوں کو اپنا نصب العین ہی یاد نہ رہے تو وہ افراد کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک قوم کبھی نہیں بنتے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد ایک قوم بنے ہی نہیں۔ ہم میں اجتماعی زندگی آئی ہی نہیں۔ ہم ایک ٹیم کی حیثیت سے میدانِ عمل میں اُترے ہی نہیں۔ ہم میں سے کسی کھلاڑی کو پتہ ہی نہیں کہ اس کا گول کون سا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے ایک کھلاڑی کی کِک ایک طرف کو لگتی رہی ہے اور دوسرے کی دوسری طرف کو۔ یہ وجہ ہے کہ ہم زندگی کے میدان میں کوئی بازی نہیں جیت سکے۔

لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ پاکستان کی سرزمین ہمارے پاس ہے۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ بالکل محفوظ شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ ہماری آئیڈیالوجی۔ یعنی قرآنِ مجید ہمارے پاس موجود ہے اور وہ بھی بالکل محفوظ شکل میں موجود ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہم اسے اپنی حکومت کا نصب العین بنالیں۔ اس سے ہم ایک امّت بھی بن جائیں گے اور صحیح اسلامی زندگی بھی بسر کرسکیں گے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

چھٹا خطبہ

حکومت تمام اُمّت کی ہوتی ہے

قال اللہ تعالٰی: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ .... (سورۃ آلِ عمران۔ آیت ۱۰۹)

اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ تم سب سے اچھی اُمّت (قوم) ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

پچھلے خطبہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ افراد اس وقت قوم بنتے ہیں جب ان سب کے سامنے ایک نصب العین ہو۔ اسے کھیل کی مثال سے سمجھایا گیا تھا جس میں گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں اور ان سب کے سامنے ایک گول ہوتا ہے۔ ہم نے یہ بھی بتایا تھا کہ ان کھلاڑیوں میں سے کوئی دائیں کی طرف ہوتا ہے کوئی بائیں طرف۔ کوئی آگے۔ کوئی پیچھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ان کھلاڑیوں کی اپنی اپنی مرضی پر موقوف ہوتا ہے کہ جس کا جہاں جی چاہے کھڑا ہو جائے اور جو جگہ جی میں آئے کرنے لگ جائے؟ ظاہر ہے کہ اس طرح بڑی ہڑبونگ مچ جائے گی۔ کھیل کے میدان میں عجیب سے ہنگم قسم کی افراتفری پھیل جائے گی۔ ایک ہی ٹیم کے کھلاڑیوں میں جھگڑے شروع ہو جائیں گے۔ جہاں ایک کھلاڑی کھڑا ہے وہاں دوسرا کھلاڑی کھڑا ہونا چاہے گا۔ وہ اپنی جگہ چھوڑنا نہ چاہے۔ یہ اس کی جگہ لینا چاہے۔ دونوں میں دھینگا مشتی شروع ہو جائے۔ بجائے اس کے کہ یہ دوسری ٹیم کا مقابلہ کریں خود آپس میں ہی الجھتے رہیں۔ ایسی صورت سے بچنے کے لئے یہ کھلاڑی اپنے میں سب سے اچھے کھلاڑی کو اپنا کپتان چن لیتے ہیں اور یہ عہد کر لیتے ہیں کہ وہ سب اس کپتان کی بات مانیں گے۔ اس بات کا فیصلہ کپتان کرتا ہے کہ کون کھلاڑی کس جگہ کھڑا ہو۔

کس کے ذمے کس قسم کا کام لگایا جائے۔ یہی ان سب کی ڈیوٹیاں لگاتا ہے۔ یہی ان کے جھگڑوں کے فیصلے کرتا ہے۔ اس طرح یہ کھلاڑی ایک ٹیم بنتے ہیں۔

جو صورت کھلاڑیوں کی ہے وہی ایک قوم یا اُمت کی ہے۔ اُمت کے افراد کبھی اُمت کی شکل میں نہیں رہ سکتے اگر ان کا کوئی کپتان نہ ہو۔ اُمت کے افراد اپنے میں سے بہترین فرد کو چن کر اپنا بڑا مان لیتے ہیں اور سب اس کی ہدایات کے مطابق چلتے ہیں۔ اس سے ان میں باہمی نظم اور ضبط قائم رہتا ہے۔ اس سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے اہل بنتے اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچتے ہیں۔ قوم کے اس بڑے فرد کو آج کل کی اصطلاح میں صدرِ مملکت یا (HEAD OF THE STATE) کہتے ہیں۔ یعنی مملکت کا سربراہ۔ ہماری اصطلاح میں اُسے خلیفۃ المسلمین یا امیرالمومنین کہا جاتا ہے۔ سوال اصطلاح کا نہیں۔ حقیقت کا ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ وہ اُمت کا بہترین فرد۔ اُمت کا چنا ہوا۔ اُمت کی ٹیم کا کپتان ہوتا ہے۔

ٹیم اور اس کے کپتان۔ یا قوم اور مملکت کے سربراہ کا معاملہ عجیب ہوتا ہے۔ ٹیم کا کپتان، ٹیم سے باہر کھڑا ہو کر حکم نہیں چلاتا۔ وہ گیارہ کھلاڑیوں میں سے ایک کھلاڑی ہوتا ہے۔ وہ انہی کی طرح ٹیم کے اندر۔ ٹیم کے ساتھ مل کر کھیلتا ہے۔ وہ جب ڈیوٹیاں تقسیم کرتا ہے تو اپنے ذمے بھی ایک ڈیوٹی لیتا ہے۔ وہ اس ڈیوٹی کو ایک عام کھلاڑی کی طرح سرانجام دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ساری ٹیم کو مناسب ہدایات بھی دیتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ٹیم کے کپتان کو دُہرے فرائض سرانجام دینے پڑتے ہیں۔ یہی حالت امت کے سربراہ کی ہے۔ وہ امت کا ایک فرد۔ یا یوں سمجھئے کہ مملکتِ پاکستان کا ایک عام شہری ہوتا ہے۔ اور اس کے ذمے وہ تمام فرائض ہوتے ہیں جو دوسرے شہریوں کے ذمے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے ذمے یہ کام بھی ہوتا ہے کہ وہ ساری قوم کی سربراہی کرے۔ انہیں مناسب ہدایات دے اور اس کا اطمینان کرے کہ ہر فرد اپنا اپنا فریضہ صحیح طور پر ادا کر رہا ہے۔ اس لئے اُسے باقیوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔

لیکن کپتان مقرر کر لینے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ باقی کھلاڑی اطمینان سے بیٹھ جائیں اور سمجھ لیں کہ سارا کام کپتان خود ہی کرے گا۔ وہی گول کرے گا اور وہی اکیلا مقابل کی ٹیم کو شکست دیدے گا۔ بالکل نہیں۔ جب تک ٹیم کا ہر ایک کھلاڑی اپنی اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر سرانجام نہیں دے گا، ٹیم کبھی جیت نہیں سکے گی۔ اور کوئی کھلاڑی اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر سرانجام نہیں دے سکتا جب تک وہ کپتان کی ہدایات کی اطاعت نہ کرے۔ لہٰذا

(۱) ٹیم کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے میں سے بہترین فرد کو اپنا کپتان چُنے۔

(۲) کپتان کا کام یہ ہے کہ وہ ٹیم کو بہترین ہدایات دے۔ اور

(۳) ٹیم کے ہر کھلاڑی کا کام یہ ہے کہ وہ کپتان کی ہدایت کے مطابق اپنا فریضہ سرانجام دینے میں پوری پوری کوشش کرے۔

جو ٹیم اس طرح کرے گی وہ کامیاب ہو جائے گی۔ پھر یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ ٹیم کی جیت کپتان کی جیت اور ٹیم کی ہار کپتان کی ہار نہیں کہلاتی۔ جیتتی بھی ٹیم ہے اور ہارتی بھی ٹیم ہے۔ یہی حالت قوم کی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنا سربراہ اچھا نہیں چُنتی۔ اگر وہ سربراہ صحیح ہدایات نہیں دیتا۔ اگر قوم کے افراد اپنے سربراہ کی ہدایات کی اطاعت

نہیں کہ تے تو زندگی کے میدان میں اس قوم کو مخالف اقوام کے مقابلہ میں شکست ہو جاتی ہے۔ یہ شکست ساری قوم کی ہوتی ہے۔ جس طرح جیت ساری قوم کی جیت ہوتی ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ قوم کا سربراہ جو فیصلے کرتا ہے وہ اس کے ذاتی فیصلے نہیں ہوتے بلکہ ساری قوم پر ان کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ ساری قوم کے فیصلے ہوتے ہیں۔ قوم کا سربراہ جو معاہدات دوسری اقوام سے کرتا ہے وہ بھی اس کے ذاتی معاہدات نہیں ہوتے۔ ان کی ذمہ داری پوری قوم پر عائد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (سورۃ الشوریٰ۔ آیت ۳۸)۔ ان کی حکومت باہمی مشورہ سے ہوتی ہے۔ اور اسی لئے، جیسا کہ اُس آیت میں کہا گیا ہے جو شروع میں تلاوت کی گئی ہے، قرآن کریم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی بھلائیوں کے حکم دینے اور برائیوں سے روکنے) کا فریضہ، ساری امت کا قرار دیا ہے۔ صرف اُمت کے سربراہ کا فریضہ قرار نہیں دیا۔ گویا ایک اسلامی حکومت کی طرف سے جس قدر احکامات نافذ ہوتے ہیں، وہ ساری اُمت کی طرف سے نافذ شدہ احکام سمجھے جاتے ہیں۔ وہ حکومت ساری امت کی ہوتی ہے۔ کسی خاص گروہ یا خاص فرد کی حکومت نہیں ہوتی۔

اس ضمن میں ایک اہم بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ کیا ٹیم کے کپتان کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کا حکم جی میں آئے دیدے یا اس پر بھی کوئی پابندی عائد ہوتی ہے؟ اس بات کے سمجھنے کے لئے آپ فٹ بال کے کھیل کو پھر سے سامنے لائیے۔ اس میں ایک قاعدہ یہ ہے کہ بال کو ہاتھ نہ لگنے پائے۔ اگر کسی کھلاڑی کا بال کو ہاتھ لگ گیا تو وہ مجرم سمجھا جائے گا۔ ٹیم کے کپتان کو اس کا حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ کسی کھلاڑی سے یہ کہہ دے کہ تم بال کو ہاتھ سے بھی چھو سکتے ہو۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کپتان کے اختیارات اُن قاعدوں کے ماتحت ہوتے ہیں جو کھیل کے لئے بطور اصول اختیار کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے خطبہ میں بتایا گیا تھا، اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں ایسی مستقل اقدار یا اصول دیئے ہیں جن میں کبھی ردوبدل نہیں ہو سکتا۔ اسلامی مملکت ان مستقل اقدار یا نہ بدلنے والے اصولوں کو عملاً نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لئے اسلامی مملکت کے سربراہ کو اس کا حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ ان اصولوں میں کسی قسم کا ردوبدل کر سکے یا ان کے خلاف کوئی حکم نافذ کر سکے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (سورۃ انعام۔ آیت ۳۴)۔ خدا کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ اس لئے حکومت کا سربراہ یا کوئی اور نہ تو ان مستقل اصولوں میں کوئی ردوبدل کر سکتا ہے اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی حکم دے سکتا ہے۔ یہ زندگی کے میدان کے اٹل قانون ہیں۔ ان کی پابندی ہر حال میں ضروری ہوتی ہے۔

ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، فٹ بال کے کھیل کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ بال کو کسی کا ہاتھ نہیں لگنا چاہیئے۔ اس قاعدے سے کوئی مستثنےٰ نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ کھلاڑیوں کو تو اس کی اجازت نہ ہو کہ وہ بال کو ہاتھ لگا سکیں لیکن کپتان کا جی چاہے تو بال کو پاؤں سے کک لگا دے اور جی چاہے تو ہاتھ سے پکڑ لے۔ بالکل نہیں۔ قاعدے کی پابندی ہر ایک کو یکساں طور پر کرنی ہوتی ہے۔ یہی صورت اسلامی حکومت کی ہے۔ اس میں خدا کے مقرر کردہ اصول ہر ایک پر یکساں طور پر نافذ ہوتے ہیں۔ مملکت کی بڑی سے بڑی ہستی بھی ان اصولوں سے بالا نہیں ہوتی۔ اور تو اور، خود حضور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)

کی زبان مبارک سے کہلوا دیا گیا کہ: اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (سورۃ انعام۔ آیت ۱۶۴) "میں اُن میں سب سے پہلا ہوں جو قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے ہیں۔"

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں، مملکت کے سربراہ کو باقی افرادِ امت کے مقابلہ میں کوئی خصوصیت یا رعایت حاصل نہیں۔ وہ خدا کے مقرر کئے ہوئے اصولوں میں ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ وہ ان کے خلاف کوئی حکم صادر نہیں کر سکتا۔ اسے سب سے پہلے ان قوانین کی اطاعت کرنی ہوتی ہے۔ وہ اگر ان کی خلاف ورزی کرے تو اس سے بھی اسی قسم کا مواخذہ ہوگا جس قسم کا مواخذہ قوم کے ایک عام فرد سے ہوگا۔ اور اسے بھی اسی قسم کی سزا ملے گی۔ چنانچہ خود حضور رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (سورۃ انعام۔ آیت ۱۵) ان سے کہہ دو کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن (یعنی مکافاتِ عمل کے وقت) سے ڈرتا ہوں۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں:-

(۱) افرادِ امت اپنے میں سے بہترین فرد کو اپنا سربراہ چن لیتے ہیں۔

(۲) وہ سربراہ مملکت کے تمام اختلافی معاملات طے کرتا ہے۔

(۳) افرادِ امت پر اس کے فیصلوں کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔

(۴) لیکن وہ اپنے فیصلوں میں ڈکٹیٹر نہیں ہوتا۔ اُسے ان اصولوں کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں۔

(۵) اس بارے میں اس میں اور ایک عام فردِ امت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو اسلامی حکومت کسی فرد یا کسی گروہ کی حکومت نہیں ہوتی۔ وہ ساری کی ساری قوم (یا امت) کی حکومت ہوتی ہے۔ اور اس میں تمام فیصلے۔ احکام اور قوانین، خدا کے مقرر کردہ اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے مرتب ہوتے ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کوئی نہیں کر سکتا۔ اس طرزِ حکومت کا اثر دنیا کے دوسرے انسانوں پر کیا پڑتا ہے اور یہ حکومت باقی حکومتوں کے مقابلہ میں سب سے اچھی کیوں ہوتی ہے۔ اس کی بابت کبھی پھر بتایا جائے گا۔ والسلام

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں!

کتب خانہ کے اوقات کار حسبِ ذیل ہیں
ہر روز علاوہ جمعہ:- شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ:- صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

نیز کتب خانہ میں ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات بھی دستیاب ہیں اور ایک کارڈ تحریر کر کے منگوائی بھی جا سکتی ہیں

محمد اسلام۔ کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۴۔ ہارون چیمبرز الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی کراچی ۲

شہدائے جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یاد میں

صورِ اسرافیل

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح، پو پھٹنے سے بھی پہلے، ہندو نے، اپنی روایتی خوئے کمینگی کے مطابق، الٹی میٹم تو ایک طرف، کسی سابقہ تنبیہہ یا اطلاع کے بغیر، اچانک پاکستان پر حملہ کر دیا اور چپ چاپ، واہگہ کی سرحد پار کر کے، نہر بی آر بی کے کنارے تک آ پہنچا۔ یہ راز ابھی تک نہیں کھل سکا کہ وہ نہر پار کر کے آگے کیوں نہ بڑھا۔ حالانکہ نہر پر وہ پل موجود تھا جس پر سے ٹینک تک بھی گزارے جا سکتے تھے۔

ملک میں یہ خبر عام ہوئی تو قوم کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ فضا پر خوف و ہراس کے بادل چھا گئے۔ عین ممکن تھا کہ ان میں مایوسیوں کی لہر بھی اُبھر آتی کہ اتنے میں ریڈیو پر، صدرِ محترم، محمد ایوب خان (مرحوم) کی آواز اُبھری۔ آواز کیا تھی؛ بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک تھی جس نے صورِ اسرافیل کا کام کیا۔ قوم کے دل میں تازہ ولولے بیدار، اور اس کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑنے لگا۔ وہ بیک جست، ہر خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے مردانہ وار اٹھ کھڑی ہوئی۔ ریڈیو کی یہ تقریر تو تھی چند ٹانبوں پر مشتمل لیکن چونکہ وہ ایک مردِ مومن کے دل سے اُبھری تھی اس لئے براہِ راست قوم کے دل میں اتر گئی۔ جب تک پاکستان قائم ہے (خدا اسے ابدالآباد تک قائم و دائم رکھے) اس کے در و دیوار سے اس بانگِ رحیل کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہے گی۔ طلوعِ اسلام، غازیان اور شہدائے جنگِ ستمبر ۶۵ء کی یاد میں، اس تقریر کا نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔

(۰)

صدرِ مملکت کا اعلانِ جہاد

عزیز ہم وطنو! السلام علیکم!

دس کروڑ پاکستانی عوام کی آزمائش کا وقت آگیا ہے۔ بھارتی فوج نے علی الصبح مملکتِ پاکستان کی حدود میں لاہور کے محاذ پر حملہ کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنی روایتی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اس مسافر ٹرین پر بمباری کی جو وزیر آباد ریلوے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ بھارتی حکمران گذشتہ پانچ ماہ کے دوران پاکستان کے خلاف جو جارحانہ اقدامات کرتے آئے ہیں، یہ تازہ حملہ انہی مجرمانہ سرگرمیوں کی ایک کڑی ہے۔

بھارتی حکمرانوں نے گذشتہ مئی میں خط متارکہ جنگ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہماری حدود میں کرگل کی تین چوکیوں پر قبضہ کر کے اپنے جارحانہ اقدام کی ابتداء کی تھی۔ اقوام متحدہ کی مداخلت پر بھارتی فوجیوں نے یہ چوکیاں عارضی طور پر خالی کر دیں اور اگست میں ان پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

بھارت نے جارحانہ اقدامات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ٹیٹوال کے علاقے میں ہماری چوکیوں پر قبضہ کرنے کے لئے پیش قدمی کی۔ اس کے بعد بھارتی فوج اپنی پوری طاقت کے ساتھ اڑی اور پونچھ کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ بھارت خط متارکہ جنگ کی صریح خلاف ورزی سے بھی مطمئن نہ ہوا بلکہ اُس نے پاکستان کے موضع اعوان پر گولہ باری کر دی۔ اب یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ ان تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود ہم نے جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تھا، بھارتیوں نے اس کا مطلب غلط سمجھا۔ بالآخر بھارتی جارحیت کو روکنے کے لئے آزاد کشمیر کی افواج کو مقبوضہ کشمیر کے علاقہ میں داخل ہونا پڑا۔ اب بھارت جنون کے عالم میں اپنی فضائی فوج کو جارحانہ کارروائیوں کے لئے حرکت میں لے آیا اور اس طرح ایک شدید بحران کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

اس وقت تک یہ حقیقت ساری دنیا پر واضح ہو گئی ہے کہ کشمیر میں بھارت کا جارحانہ اقدام دراصل پاکستان پر حملہ کا آغاز تھا۔ بھارت نے قیام پاکستان کے فوری بعد اس ملک کے خلاف جن معاندانہ عزائم کی پرورش کی تھی آج اس کا عملی ثبوت مہیا کر رہا ہے۔ بھارتی حکمرانوں نے پاکستان کی آزاد مملکت کو، جسے مسلمانوں نے اپنے وطنِ عزیز کے طور پر مستحکم بنایا، کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔ گذشتہ اٹھارہ سال کے دوران میں ان کی تمام جنگی تیاریوں کا مقصد پاکستان کے خلاف کارروائی تھا۔

بھارتی حکمرانوں نے چینی خطرے کا ہوا کھڑا کر کے بعض دوست ممالک سے زبردست امداد حاصل کی۔ ہمارے یہ مغربی دوست بھارتی حکمرانوں کے اصل مقاصد کو سمجھ ہی نہ سکے۔ انہوں نے بھارت کے ان اعلانوں پر یقین کر لیا کہ پوری طرح مسلح ہونے کی صورت میں وہ چینیوں سے جنگ کریں گے۔ یہ بات ہمیشہ ہمارے علم میں رہی کہ یہ اسلحہ ہمارے خلاف استعمال ہو گا۔ وقت نے ہمارے اس اندیشہ کی تصدیق کر دی۔

اب بھارتی حکمرانوں نے کسی رسمی اعلانِ جنگ کے بغیر اپنی روایتی بزدلی اور عیاری سے کام لیتے ہوئے اپنی فوج کو پاکستان کی مقدس سرزمین میں داخل ہونے کا حکم دیا ہے۔ ہمارے لئے وقت آ گیا ہے کہ دشمن کو دندان شکن جواب دیں اور بھارتی سامراجیت کو کچل کر رکھ دیں۔

حالات نے دشمن سے مقابلہ کے لئے لاہور کے بہادر شہریوں کا سب سے پہلے انتخاب کیا۔ تاریخ ان جواں مردوں کے کارنامے اس عبارت کے ساتھ زندہ رکھے گی کہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے دشمن کی تباہی کے لئے آخری ضرب لگائی۔

پاکستان کے دس کروڑ عوام جن کے دلوں میں لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے مقدس کلمات بسے ہوئے ہیں اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جبتک بھارتی توپوں کے دہانے

ہمیشہ کے لئے سرد نہیں پڑ جاتے۔ بھارتی حکمران نہیں جانتے کہ انہوں نے کس جری قوم کو چھیڑنے کی جسارت کی ہے۔ پاکستانی عوام جو اپنے عقائد کی سربلندی اور اپنے مقصد کی صداقت پر کامل ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ کے نام پر فردِ واحد کی طرح متحد ہو کر دشمن کے خلاف جنگ آزما ہوں گے۔ نوعِ انسانی کو اللہ تعالےٰ کی یہ بشارت ہے کہ حق کا ہمیشہ بول بالا ہوگا۔

ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ جنگ شروع ہو گئی ہے ہمارے صف شکن سپاہی دشمن کو پسپا کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ پاکستان کی آزاد افواج دشمن کے حملہ کا منہ توڑ جواب دیں گی۔ یہ افواج جو ایک ناقابلِ شکست جذبہ اور غیر متزلزل ارادے کی مالک ہیں دشمن کو کچل کر رکھ دیں گی۔ حکومتِ پاکستان پوری طرح تیار ہے اور اس کے تمام وسائل موجودہ صورتِ حال سے مقابلہ کے لئے وقف ہوں گے۔ بھارتی جارحیت کے خلاف اس جدوجہد میں ہمیں بلاشبہ ان تمام ملکوں کی ہمدردی اور تعاون حاصل رہے گا جو امن اور آزادی پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم نے یہ کارروائی اقوامِ متحدہ کے منشور کے باب ہفتم کے تحت کی ہے۔ جس میں ہر ملک کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی مدافعت کا حق دیا گیا ہے۔

عزیز ہم وطنو! آزمائش کی اس ساعت میں تمہیں پُرسکون رہنا ہوگا۔ ہم میں سے ہر فرد کو ایک عظیم فریضہ ادا کرنا ہے۔ جس کے لئے عقیدے کی پختگی اور والہانہ سپردگی درکار ہے۔ خدائے بزرگ و برتر اپنی رحمتِ بے پایاں سے تمہیں کامیابی نصیب کرے گا۔ حق کی فتح ہوگی۔ دشمن پر کاری ضرب لگانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ کیونکہ شکست اور تباہی اس باطل کا مقدر ہے جس نے تمہاری سرحد پر سر اٹھایا ہے۔ مردانہ وار آگے بڑھو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔ پاکستان پائندہ باد

(فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں۔ صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء)

بقیہ:۔ درس قرآن (ص ۸ سے آگے)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۱۶۶ لیاقت روڈ۔

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چوہدری شاہنواز صاحب۔ عابد سلک اینڈ سٹورز عقب اڈہ لاریاں (مائی دی جھگی) (فون نمبر 30890)

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۳½ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ سول لائنز (بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام بمقام ۱۱/۱/بی۔ بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون 72071)

لیہ میں ہر جمعہ بعد نماز مغرب (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب۔ سرکلر روڈ۔

جرمِ زنا کی سزا

پاکستان میں حال ہی میں جو چند فقہی قوانین نافذ کئے گئے ہیں (انہیں شرعی حدود کہہ کر پکارا جاتا ہے) ان کی رُو سے جرمِ زنا کی سزا کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اگر مجرم غیر شادی شدہ ہوں تو انہیں سو سو کوڑے مارے جائیں اور اگر وہ شادی شدہ ہوں تو انہیں سنگسار کیا جائے۔ اسے اصطلاح میں رجم کہا جاتا ہے۔ یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کر دینا۔ ہم نے طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۷۹ء میں ان قوانین کا مختصر سا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا کہ قرآنِ مجید میں جرمِ زنا کی سزا صرف کوڑے مقرر کی گئی ہے، بلا تخصیص اس امر کے کہ مجرم شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ۔ اس میں رجم کی سزا کا کوئی ذکر نہیں۔ لہٰذا، یہ سزا قرآنِ مجید کے خلاف ہے۔ ہم نے اس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اس لئے کہ جب یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں بات قرآنِ مجید کی نصِ صریح کے خلاف ہے تو اس کے متعلق مزید کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے پاس استفسارات آ رہے ہیں جن میں کہا جاتا ہے کہ اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اس سزا کا ثبوت روایات سے ملتا ہے۔ ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ ہمارے نزدیک جو روایت قرآنِ مجید کے خلاف ہو اس کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف کی ہی نہیں جا سکتی۔ اس کے متعلق بلا تأمل کہہ دینا چاہیئے کہ وہ وضعی ہے۔ رسول اللہؐ نے ایسا ہرگز نہیں فرمایا ہوگا۔ کیونکہ حضورؐ کا کوئی قول یا فعل قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔

کوئی دو سال ادھر کی بات ہے جرمِ زنا کی سزا کے عنوان سے محترم پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا ایک مقالہ (طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۷ء میں) شائع ہوا تھا۔ وہ قدرے مفصل تھا۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ مستفسرین کے تقاضوں کے پیشِ نظر اسے دوبارہ شائع کر دیا جائے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پاکستان میں اس قانون کے نفاذ کا سوال بھی سامنے نہیں آیا تھا۔ لہٰذا، اس وقت اس مقالہ کی حیثیت نظری اور تحقیقاتی تھی۔ لیکن اب اس کی افادیت کم ہونے کے بجائے اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

(۰)

جرمِ زنا کی سزا

(پروفیسر رفیع اللہ شہاب)

قرآنِ حکیم کا یہ انداز ہے کہ اس نے چند احکام تو متعین طور پر دیئے ہیں اور زندگی کے دیگر معاملات کے متعلق اصول اور اقدار عطا کئے ہیں۔ جس کتابِ عظیم کو تمام اقوامِ عالم اور تمام زمانوں کے لئے ضابطہ، رہنمائی بننا تھا، اس کا یہی اسلوب ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن احکام ہوں یا اصول اس نے تکمیلِ دین کے اعلان کے ساتھ واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶)

تیرے رب کی تمام باتیں صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہوگئیں اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

اس کے ساتھ، اس کی بھی وضاحت کر دی کہ یہ کتاب انسانی رہنمائی کے لئے کافی ہے اس لئے اس میں کسی اضافہ کی بھی ضرورت نہیں پڑیگی۔ سورۂ عنکبوت میں ہے:۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (۲۹/۵۱)

کیا یہ ان کے لئے کافی نہیں کہ خدا نے تیری طرف یہ کتاب نازل کر دی جو ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

۲۔ قرآنِ مجید میں جو احکام متعین طور پر دیئے گئے ہیں ان میں چار جرائم کی سزائیں بھی شامل ہیں۔ فقہ کی اصطلاح میں ان سزاؤں کو حدود کہا جاتا ہے۔ وہ جرائم ہیں، زنا (جس میں ناحق تہمت تراشی بھی شامل ہے) سرقہ، قتل اور بغاوت۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر ان میں سے زنا کی سزا ہے۔ اس کے متعلق قرآنِ مجید میں واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ:۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۠ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَاۗىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۴/۲)

زانی مرد اور زانیہ عورت میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگاؤ۔ اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو قانونِ خداوندی کے نفاذ میں کسی قسم کی نرمی مت برتو۔ اور یہ سزا اس طرح دو کہ مومنین کی ایک جماعت وہاں موجود ہو۔

قرآنِ مجید میں یہی ایک مقام ہے جہاں زنا کی سزا کا ذکر ہے۔ چونکہ یہ حکم متعین طور پر دیا گیا ہے اس لئے کسی دوسرے مقام پر اس کی مزید وضاحت کی ضرورت لاحق نہ ہوئی۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ قرآن تمہارے لئے کافی ہے۔ جب تک صدرِ اوّل میں قرآنی نظام نافذ رہا حسبنا کتاب اللہ،

مملکتِ اسلامی کا دستور رہا، لیکن جب وہ نظام باقی نہ رہا تو پھر یہ تصور پیدا کیا گیا کہ انسانی رہنمائی کے لئے قرآن کافی نہیں۔ اس میں حک و اضافہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں زنا کی سزا کے متعلق کہا گیا کہ قرآن میں متعین کردہ سزا غیر شادی شدہ کے لئے ہے۔ شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا رجم یعنی سنگسار کرنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر اُمت میں یہ خیال اُبھرا ہوگا کہ ایسا اہم حکم خود قرآن کریم میں کیوں نہ دیا گیا۔ یہ تو قرآن پر اضافہ ہے۔ اب بجائے اس کے کہ اس کا اعتراف کیا جاتا کہ یہ واقعی قرآن پر اضافہ ہے، کہا یہ گیا کہ نہیں! یہ حکم خود قرآن میں موجود تھا لیکن جو قرآن اُمت کے پاس ہے اس میں یہ آیت نہیں رہی۔ یہ ایسا عذرِ گناہ تھا جس پر زمین لرز جاتی، آسمان پھٹ پڑتا۔ لیکن اس عقیدہ کے وضع کرنے والوں کے دل میں اس سے ذرا سی لرزش بھی نہ پیدا ہوئی اور انہوں نے اس کی تائید میں روایات وضع کر لیں۔ چنانچہ حضرت ابی بن کعبؓ سے یہ روایت بیان کی گئی:۔

عن زر بن حبیش، قال قال لی ابی بن کعب کاین تعد سورۃ الاحزاب قلت اثنین و سبعین آیۃ او ثلاثۃ و سبعین آیۃ۔ قال ان کانت لتعدل سورۃ البقرۃ۔ کنا نقرأ فیھا آیۃ الرجم قلت وما ایۃ الرجم؟ قال اذا زنیا الشیخ والشیخۃ فارجموھا البتۃ۔ نکالا من اللہ۔ واللہ عزیز حکیم۔ (الاتقان فی علوم القرآن۔ جلد دوم۔ صـ ۲۵)

حضرت زر بن حبیش سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت ابی بن کعب نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ سورۂ احزاب میں کتنی آیات تھیں؟ میں نے کہا کہ یہی ۷۲-۷۳ (جو سورۂ احزاب میں موجود ہیں) انہوں نے کہا کہ نہیں۔ سورۂ احزاب میں سورۂ بقرہ جتنی آیات تھیں۔ (یعنی ۲۸۶ ناقل)۔ ان میں ایک آیہ رجم بھی تھی جس کی ہم تلاوت کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آیت رجم کیا تھی، فرمایا کہ جب بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت زنا کے مرتکب ہوں تو انہیں سنگسار کر کے ختم کر دیا جائے۔ یہ اس اللہ کی طرف سے سزا مقرر ہے جو غلبہ اور حکمت والا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ اس روایت میں الفاظ الشیخ والشیخۃ آئے ہیں۔ عربی زبان کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ ان کے معنی ہیں بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔ لیکن ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ان سے مراد ہیں شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت۔ عربی زبان میں یہ الفاظ ان معانی میں کہیں نہیں آئے۔ لیکن ان واضعینِ روایت نے تو زانیوں کو دو قسموں میں منقسم کرنا تھا۔ اس لئے سورۂ النور کی آیت میں جو الفاظ ــــ اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ آئے ہیں، ان کے معنی کئے گئے "غیر شادی شدہ عورت اور غیر شادی شدہ مرد" اور اس کے بالمقابل الشیخ والشیخۃ کے معنی کئے گئے "شادی شدہ مرد" اور "شادی شدہ عورت"۔

اس روایت میں ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ سورۃ احزاب میں سورۃ بقرہ جتنی آیات تھیں۔ یعنی ۲۸۶ آیات۔ قرآن مجید میں سورۃ احزاب کی کل آیات ۷۳ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بقایا ۲۱۳ آیات کا کیا ہوا؟ ـــــ وہ کہاں چلی گئیں؟ ان میں سے ایک آیت کے متعلق جو رجم سے متعلق تھی انہوں نے تحقیق کرلی۔ غور سے سنیئے کہ وہ تحقیق کیا تھی۔ سنن ابن ماجہ میں (جو صحاح ستہ کی ایک مستند کتاب ہے)۔ کہا گیا ہے کہ جب قرآنِ کریم مرتب کیا جانے لگا تو صحابہ کرامؓ کو دو آیتیں کہیں نہ مل سکیں۔ ایک آیت رجم سے متعلق تھی، اور دوسری رضاعت سے متعلق۔ چنانچہ وہ ان آیات کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے فرمایا کہ:۔

آیہ رجم اور آیہ رضاعتِ کبیر ایک صحیفہ میں تھیں جو میرے تخت کے نیچے تھا۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہم لوگ اس حادثہ میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں گھر کی پالتو بکری اندر گھس گئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی۔

لہٰذا، ان دونوں آیات کا دنیا میں وجود ہی باقی نہ رہا۔ لیکن (روایات کی رُو سے) اس کے باوجود صحابہؓ کو اس پر اصرار تھا کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں ہم آیہ رجم کی تلاوت کیا کرتے تھے اور ایسا کہنے والوں میں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ لوگوں نے آپ سے کہا۔ (غالباً اس زمانہ میں جب وہ برسرِ اقتدار آئے) کہ جب آپ خود کہتے ہیں کہ آپ بھی اس آیت کی، رسول اللہؐ کے زمانے میں تلاوت کیا کرتے تھے تو آپ اسے قرآنِ کریم میں درج کیوں نہیں کر دیتے؟ آپ کا جواب ملاحظہ فرمائیے:۔

وقال عمرؓ لولا ان یقول الناس زاد عمر فی کتاب اللہ لاثبتہ فی المصحف۔ (تفسیر کبیر۔ از امام رازی۔ نیا ایڈیشن۔ جلد ۳۲۔ صفحہ ۱۳۴)

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس آیت کو قرآن میں ضرور درج کر دیتا۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے خواہ مخواہ قرآن مجید میں اضافہ کر دیا۔

اس پر سوال پیدا ہوا کہ پھر خدا کے اس حکم کی تعمیل کیسے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ ہم اس آیت کو قرآن میں تو درج نہیں کریں گے لیکن تعمیل اس کی کرتے رہیں گے۔ چنانچہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ موجود ہے کہ:۔

(۱) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآنِ حکیم میں موجود تو ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ وہ صرف تلاوت کے لئے رہ گئی ہیں۔ اور

(۲) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآنِ حکیم میں تو موجود نہیں۔ لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ جیسے آیہ رجم۔

آپ نے غور فرمایا کہ رجم (سنگساری) کا حکم کس طرح قرآنِ مجید سے ثابت کیا گیا؟ اس پر تو آپ غور کریں یا نہ کریں، لیکن اس پر ضرور غور کیجئے گا کہ اس کے بعد خود خدا کی کتاب کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اہلِ حدیث ہوں یا اہلِ فقہ قرآنِ حکیم کی اس حیثیت پر سب متفق ہیں۔

یہ تو رہا رجم کا حکم۔ اس کے بعد اس کی حکمت بھی بیان کی گئی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ ایسا کرنا عین مطابق فطرت ہے۔ ہمارے ہاں احادیث کے چھ مجموعوں کو صحیح قرار دیا جاتا ہے اور ان میں بخاری کا مجموعہ سرفہرست ہے ـــ اس موضوع پر بخاری کی دو ایک روایات ملاحظہ فرمائیے:۔

عن عمرو بن میمون قال رأیت فی الجاهلیة قردة اجتمع علیها قرود قد زنت فرجموها فرجمت معهم۔

(صحیح بخاری باب ایام الجاہلیۃ)

حضرت عمرو بن میمون سے روایت ہے (جو ایک صحابی ہیں) کہ زمانۂ جاہلیت میں، میں نے ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا کا ارتکاب کیا۔ سب بندر اس کے گرد جمع ہو گئے اور اسے سنگسار کیا۔ اور میں نے بھی ان کے ساتھ پتھر مارے۔

اس روایت میں تو اس واقعہ کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل صحیح بخاری کے شارح امام ابن حجر عسقلانی نے اس طرح بیان فرمائی ہے:۔

عن عمرو بن میمون قال کنت فی الیمن فی غنم لاهلی وانا علی شرف۔ فجاء قرد مع قردة۔ فتوسدها فجاء قرد اصغر منه۔ فغمزها۔ فسلت یدها من راس القرد سلا رفیقا۔ فتبعته۔ فوقع علیه وانا انظر۔ ثم رجعت وجعلت تدخل یدها تحت قرد اول برفق۔ فاستقظ فزعا۔ فشمها۔ فصاح فاجتمعت القرود فجعل یصح ویوحی الیها بیده۔ فذهب القرود یمنة ویسرة فجاؤا بذلك القرد اعرفه۔ فحفروا لها حفرة فرجموها۔

(فتح الباری شرح صحیح بخاری از ابن حجر عسقلانی۔ جلد ہفتم صفحہ ۱۲۱)

حضرت عمرو بن میمون فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ یمن میں اپنے ہاں کی بکریاں چرا رہا تھا اور میں ایک اونچی جگہ پر کھڑا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بندر، بندریا کو ساتھ لئے ہوئے آیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ اس کے بعد (پہلے بندر کے مقابلے میں) نسبتاً کم عمر کا بندر آیا۔ اس نے بندریا کو آنکھ ماری۔ تو اس نے آہستہ سے بندر کے سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس (نوجوان) بندر کے پیچھے چل پڑی۔ اس بندر نے اس کے ساتھ مباشرت کی جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر وہ لوٹی اور پہلے بندر کے سر کے نیچے آہستہ سے اپنا ہاتھ دینے لگی۔ لیکن وہ گھبرا کر جاگ اٹھا۔ اس نے (محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے) چنانچہ اس نے بندریا

ط حیوانات کے متعلق زنا کا تصور پیش کرنا، ان وضعی روایات ہی کا حصہ ہے۔

کو سونگھا تو سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔ اس نے دُہائی مچانا شروع کر دی۔ اس پر بہت سے بندر جمع ہو گئے۔ وہ بندریا کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر چیختا رہا۔ چنانچہ وہ بندر اِدھر اُدھر دَوڑے اور اس (مجرم) بندر کو پکڑ لائے۔ جسے میں پہچانتا تھا۔ انہوں نے ان دونوں کے لئے گڑھا کھودا اور پھر انہیں سنگسار کر دیا۔ (جیسا کہ اصل روایت میں کہا گیا ہے خود حضرت عمرو بن میمون نے بھی انہیں کچھ پتھر مارے تھے)۔

یہ ہے اس سزا کی تائید میں فطرت کی گواہی، جسے ان روایات کی رُو سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

(○)

کہا یہ جاتا ہے کہ کسی زانی یا زانیہ کو رجم کی سزا دیجئے اور پھر دیکھئے کہ معاشرہ سے زنا جیسا فعلِ شنیع کس طرح ختم نہیں ہوتا۔ یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے کہ اس سے اس جرم کا ارتکاب ختم ہو جائے گا یا نہیں، قرآن کریم میں جرمِ قتل کی سزا موت مقرر کی گئی ہے۔ اور یہی سزا ہمارے مروّجہ قانون کی رُو سے بھی قاتل کو دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود قتل کی وارداتوں کا ختم ہو جانا تو ایک طرف ان میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ محض سزا دینے سے جرم رُک نہیں جاتا۔ جرائم کے سدِّباب کے لئے افراد کے قلب و نگاہ کی تطہیر اور معاشرے کے اجتماعی نظام کی اصلاح ضروری ہوتی ہے۔ بہرحال یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ کہا یہ جاتا ہے کہ زانی یہ سزا دی جائے تو اس جرم کا سدِّباب ہو جائے گا۔ لیکن جُرم کی سزا تو اسی صورت میں مل سکے گی جب جُرم ثابت ہو جائے۔ ہماری فقہ نے اس جُرم کے اسباب کے لئے ایسی شرائط عائد کی ہیں، جن کی رُو سے اس جرم کا ثابت ہونا ناممکنات میں سے ہے[1]۔ مثلاً فقہ حنفی کی معتبر ترین کتاب ہدایہ شریف میں ہے:۔

(۱) من زنی فی دار الحرب او فی دار البغی ثم خرج الینا لا یقام علیہ الحد۔

(ہدایہ اوّلین مجیدی۔ صفحہ ۴۹۳)

جس نے دار الحرب یا باغیوں کے علاقے میں جرمِ زنا کا ارتکاب کیا اور پھر دار الاسلام میں آگیا، تو اس پر کوئی حد نہیں۔

وضاحت کے لئے بطورِ مثال یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص واہگہ بارڈر کے کھیت میں زناکاری کے بعد پھر پاکستان کی طرف آجائے تو اسے اس جرم کی کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ اب آگے چلئے:۔

(۲) ومن اقر اربع مرات فی مجالس مختلفۃ انہ زنی بفلانۃ وقالت ھی

---

[1] "شرعی حدود" کے نفاذ کے بعد خود صدرِ مملکت نے فرمایا تھا کہ جن شرائط سے یہ جرائم مشروط ہیں ان کے پیشِ نظر شاید ہی کسی کو شرعی سزا مل سکے۔ (طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۷۹ء)

تزوجتنی۔ او انا انزنت بالزنا وقال الرجل تزوجتها فلاحد علیہا وعلیہ المہر۔ (ایضاً)

اگر کوئی شخص (کسی ایک جگہ نہیں) چار مختلف مجالس میں (اور ایک بار ہی نہیں) چار دفعہ اقرار کرے کہ اس نے فلاں عورت سے زنا کیا ہے لیکن عورت کہے کہ نہیں، اس نے مجھ سے (پہلے) نکاح کر لیا تھا یا اسی طرح کوئی عورت ارتکابِ زنا کا اقرار کرے لیکن مرد کہے کہ نہیں میں نے اس سے نکاح کر لیا تھا، تو نہ اس مرد کو سزا دی جائے گی اور نہ اس عورت کو۔ البتہ اس مرد کے لئے ضروری ہوگا کہ اس عورت کو مہر کے پیسے ادا کر دے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ بات کہاں تک پہنچ رہی ہے؟ ان قوانین کی رُو سے نہ صرف یہ کہ زنا جیسے جرم کے ارتکاب کا کوئی سدِّباب سوچا گیا ہے، بلکہ اس کے لئے چوپاٹک کھول دیئے گئے ہیں۔

اور اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ اگر یہ زناکار خود اس جرم کے ارتکاب کا اعتراف نہ کریں تو پھر عدالت کے لئے ضروری ہوگا کہ یہ تحقیق کرے کہ اس جرم کا ارتکاب ہوا تھا یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات شہادات (گواہیوں) کی رُو سے ہی طے ہو سکے گی۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ اس شہادت کے لئے کیا کیا شرائط عائد کی گئی ہیں —— امام ابنِ رشد فرماتے ہیں:-

وان من وصفهم ان تکون عدلا وان من شرط هذه الشهادة ان تکون المعاینة فرجه فی فرجها وانها تکون بالتصریح لا بالکنایة۔

(بدایۃ المجتہد۔ جلد دوم۔ مطبوعہ مصر۔ صفحہ ۴۳۰)

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ گواہ عدل کی صفت سے متصف ہوں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہوں۔ یعنی انہوں نے بچشمِ خود اس فعل کو صادر ہوتے دیکھا ہو۔ اور اس کے بعد اسے اشاروں کنایوں سے بیان نہ کریں بلکہ پوری صراحت سے بیان کریں۔[1]

آپ سوچئے کہ کیا کوئی مرد اور عورت اس فعل کے مرتکب ایسی صورت میں ہو سکتے ہیں کہ ایک نہیں چار چار شخص اس کی ساری جزئیات تک کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ حیوانات کے جنسی اختلاط میں تو یہ چیز

---

[1] حیا مانع ہے کہ ہم ان الفاظ کا اُردو ترجمہ پیش کریں۔ امام ابنِ رشد نے تو پھر بھی قدرے محتاط انداز میں بات کی ہے۔ دیگر فقہا نے اس کی جزئیات تک کو جس صراحت سے بیان کیا ہے، ان کے ترجمے سے ان صفحات کو ملوث کرنے کی تو ہم جرأت نہیں کر سکتے! (سنہ ۱۹۷۷ء)

لیکن حالیہ نافذ کردہ قوانین میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ شہادت کے سچے ہونے کی شرط یہ ہے کہ چاروں گواہوں نے "عمل دخول" کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ (طلوعِ اسلام مارچ سنہ ۱۹۷۹ء)

ممکن ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ انسانوں کی بے حیا سے بے حیا تک کوئی قوم یا گروہ ایسا نہیں ملے گا جو نا جائز تو ایک طرف اس جائز عمل کا ارتکاب بھی اس بے حیائی کے ساتھ کرے۔ فرمایئے! کیا اس جرم کے اثبات کے لیے اس قسم کے چار گواہ مل سکیں گے؟

اور اگر بفرضِ محال ایسے چار گواہ مل بھی جائیں، لیکن ان کی گواہی کی جزئیات میں کسی قسم کا اختلاف پایا جائے۔ حتیٰ کہ اگر دو گواہ زنا بالجبر کی شہادت دیں اور دو گواہ یہ کہہ دیں کہ نہیں اس عورت نے اس مرد کو اپنی طرف مائل کیا تھا تو اس صورت میں بھی یہ جرم ثابت نہیں ہو سکے گا۔ ہدایہ میں یہ تمام تفاصیل موجود ہیں۔

ہماری فقہ کی کتابوں میں جنسیات کے متعلق اس کثرت اور تفصیل کے ساتھ مسائل درج ہوتے ہیں کہ کوئی سلیم الطبع انسان انہیں پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اور یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان طالب علموں کو جو نوجوان بھی ہوتے ہیں اور (بالعموم) غیر شادی شدہ بھی۔ جن مقامات میں لونڈیوں کا ذکر آتا ہے وہاں یہ تفاصیل فحاشی کی ہر حد کو پھاند جاتی ہیں۔ ہم اپنے دل پر جبر کر کے یہاں دو ایک مثالیں پیش کریں گے۔ ہدایہ مجتبائی اوّلین صفحہ ۴۸۹ پر لکھا ہے کہ "اگر کوئی "مَن چلا" اپنے بیٹے یا پوتے کی لونڈی سے زنا کا ارتکاب کر لے اور یہ بھی کہے کہ اسے اس کا علم تھا کہ ایسا کرنا شرعاً حرام ہے۔ اس کے باوجود اسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔" دوسری مثال تو خود ہدایہ ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

ومن وطی اجنبیۃ فیما دون الفرج یعزر۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۹۰)

اگر کوئی شخص کسی اجنبی عورت کے ساتھ شرمگاہ کے علاوہ کہیں اور اختلاط کر لے تو اسے جرم زنا کی سزا تو نہیں دی جائے گی البتہ کوئی اور چھوٹی موٹی سزا دی جا سکتی ہے۔

پھر حیا مانع ہے ورنہ ہم بتاتے کہ "کسی دوسری جگہ اختلاط" کی تفاصیل میں ہماری کتبِ فقہ میں کیا کیا کچھ کہا گیا ہے۔ اور ہمارے بڑے بڑے ائمہ نے ناواقف عورت تو ایک طرف خود اپنی بیوی کے سلسلے میں کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ تفصیل کے لیے حافظ ابن حجر عسقلانی کی شرح بخاری (فتح الباری) کے علاوہ علامہ عینی کی شرح (عمدۃ القاری) میں دیکھئے کہ اس باب میں اور تو اور امام مالکؒ تک کا کیا مسلک بیان کیا گیا ہے۔ (یہ بحث ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" میں دی گئی ہے)۔

یہ ہے رجم کی سزا کے متعلق اس حکم کا اجمالی سا تعارف جسے نافذ کرنے سے، کہا جاتا ہے کہ مملکت اسلامی بن جائے گی۔ اگر فرصت ملی تو میں سرقہ اور خمر (شراب) کی سزاؤں کے متعلق بھی اسی قسم کی تفاصیل پیش کروں گا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے اس باب میں اپنی طرف سے ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ ہر بات مستند کتب احادیث اور کتب فقہ کے حوالوں سے لکھی گئی ہے۔

یہ ہیں چند ایک مثالیں ان احکام کی جنہیں "احکامِ شریعت" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

——— (٠) ———

قانون دان حضرات توجّہ فرمائیں!

سزائے رجم کی بحث آپ کے سامنے آگئی۔ بعض قانون دان حضرات نے ہمیں لکھا ہے کہ وہ اس قانون کو شریعت بینچ میں چیلنج کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ان سے گذارش کریں گے کہ وہ ضرور ایسا کریں لیکن اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم بنیادی نکتہ پیش نظر رکھیں۔ اس سے نہ صرف یہی مسئلہ حل ہو جائیگا بلکہ جملہ قوانین شریعت کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کا محکم معیار بھی میسّر آجائے گا۔

۱۔ سورۃ النور کی آیت (۲) سے بالکل صریح ثابت ہے کہ زانی مرد اور زانی عورت کی سزا کوڑے ہے۔ رجم نہیں۔ سزائے رجم کا ذکر سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ لہٰذا رجم کی سزا قرآن کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے نہ عدالت انکار کر سکے گی نہ فریق مقابل (یعنی ارباب شریعت)

۲۔ فریق مقابل یہ دلیل پیش کریگا کہ یہ سزا سنت کے مطابق ہے۔ لیکن یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ یہ سزا قرآن مجید کے خلاف ہے، یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کہ یہ سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں۔

۳۔ دستور پاکستان کے آرٹیکل ۲۲۷ میں کہا گیا ہے:۔

تمام مروّجہ قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق مرتب کیا جائے گا جو قرآن مجید اور سنت میں مذکور ہیں اور ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو ان احکام (یعنی قرآن اور سنت) کے خلاف ہو۔

۴۔ حال ہی میں، شریعت بینچوں کے قیام کے متعلق جو آرڈیننس جاری کیا گیا ہے اس میں کہا گیا ہے:۔

مملکت پاکستان کے کسی شہری کی درخواست پر، ہائی کورٹ یہ فیصلہ کرے گی کہ جس قانون کو چیلنج کیا گیا ہے وہ اسلامی احکام کے خلاف ہے یا نہیں جو قرآن مجید اور سنت رسول اللہ میں مذکور ہیں۔

اگر ہائی کورٹ کسی قانون کو قرآن اور سنت کے خلاف قرار دیگی تو وہ کالعدم قرار پا جائے گا اور اس کی جگہ ایسا قانون نافذ کیا جائے گا جو قرآن اور سنت کے مطابق ہو۔

ان تصریحات کی رُو سے کسی قانون کے اسلامی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن اور سنت کے مطابق ہو۔ ان ہر دو شرائط میں، اوّلیت قرآن کو حاصل ہے اس لئے اگر کسی قانون کے متعلق ثابت ہو جائے کہ وہ قرآن مجید کے خلاف ہے تو وہ کالعدم قرار پا جائیگا۔ اس کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کہ وہ سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔

۵۔ ان دلائل کی رُو سے، رجم کی سزا کا قانون خلاف اسلام قرار پا جائے گا۔

ہم درخواست دہندہ حضرات سے درخواست کریں گے کہ وہ ان دلائل کی رُو سے عدالت سے یہ اصولی فیصلہ کرالیں کہ جو قانون قرآن مجید کے خلاف ہو وہ خلاف اسلام، فلہٰذا کالعدم قرار پا جائے گا۔ اس اصولی فیصلہ کا اطلاق مملکت کے جملہ قوانین پر یکساں ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ:۔

(۱) مروّجہ قوانین میں سے جو قانون قرآن مجید کے خلاف ہوگا وہ خلاف اسلام، فلہٰذا کالعدم قرار پا جائے گا۔ اور

(۲) آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جا سکے گا جو قرآن مجید کے خلاف ہو۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ کسی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی قرار پانے کے لئے کس قدر محکم بنیاد میسّر آجائے گی اور اس سے کس قدر اختلافات مٹ جائیں گے۔

دیکھیں یہ سعادت کس کے حصّے میں آتی ہے۔ جو حضرات اس ضمن میں کوئی اقدام کریں وہ اگر ہم سے رابطہ قائم کریں تو ہم ان کے شکر گذار ہوں گے۔

(۰)